اصولِ فقہ

فقہ حنفی و فقہ مالکی

شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

قانونِ اسلامی -اختصاصی مطالعہ

اصولِ فقہ--- ۲۰

فقہِ اسلامی کا تاریخی ارتقاء ---۱

فقہ حنفی و فقہ مالکی

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانون اسلامی۔ اختصامی مطالعہ

اصول فقہ۔۔۔۔ ۲۰

فقہ اسلامی کا تاریخی ارتقاء۔ ۱

عنوان	:	فقہ حنفی وفقہ مالکی
مولف	:	ڈاکٹر محمد میاں صدیقی
نظر ثانی	:	ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ادارت	:	عرفان خالد ڈھلوں
حتمی تصحیح	:	شہزاد اقبال شام
نگران مطالعہ اسلامی قانون کورس	:	عرفان خالد ڈھلوں
ناشر	:	شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مطبع	:	اظہار سنز پرنٹرز، ۹ ریٹی گن روڈ لاہور
سال طباعت	:	۲۰۰۳ء جون ۲۰۰۵ء
تعداد	:	۱۰۰۰ ۲۵۰۰

ISBN 969-8263-27-6

فہرست

۱-	پیش لفظ	۵
۲-	تعارف	۷
۳-	فقہ حنفی	۹
۴-	فقہ حنفی کے بانی	۹
۵-	انتخاب حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی احتیاط	۱۱
۶-	امام ابو حنیفہؒ کے اصول اجتہاد	۱۴
۷-	حنفی مسلک کی ترویج و اشاعت	۲۳
۸-	فقہ مالکی	۲۸
۹-	فقہ مالکی کے بانی	۲۸
۱۰-	امام مالک کے اصول اجتہاد	۳۶
۱۱-	مالکی مسلک کی ترویج و اشاعت	۴۴
۱۲-	اہم نکات	۴۸
۱۳-	کتب برائے مزید مطالعہ	۴۹
۱۴-	مصادر و مراجع	۵۰

پیش لفظ

کسی ریاست کا رائج قانون اس میں بسنے والوں کے اساسی نظریات وعقائد کا عکاس ہوتا ہے ورنہ قانون اور قوم میں اجنبیت کے باعث نہ تو قانون اس قوم میں قبولیت عام کی سند حاصل کرتا ہے اور نہ قوم اس قانون کے احترام اور پاسداری میں گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کا نتیجہ معاشرتی اشتات وانتشار اور بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر قانون اجنبی اور مسلط کردہ ہو تو اس پر عمل جبر کے تحت ہوتا ہے اور مجبور قومیں آزاد نہیں ہوتیں۔ اجنبی قانون تو وہ قومیں اپناتی ہیں جو خود کسی دستور اور نظم قانون سے تہی دامن ہوتی ہیں۔

مسلم امہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ دستور سازی اور قانون سازی پر اس کا علمی ورثہ بہت گراں قدر ہے۔ گذشتہ ۱۳ صدیوں سے مسلمان اہل علم کی تحریریں قانون اور اصول قانون پر دنیا بھر کی رہنمائی کر رہی ہے۔ امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ)، امام محمد شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) اور امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کی کتابیں آج بھی روشنی کا منبع ہیں۔

امت مسلمہ کے قانونی اور دستوری نظام کے دو بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر اسلام کا قانونی نظام نہ تو اپنی صحیح شکل وصورت میں قائم رہتا ہے اور نہ ان سے فکری غذا حاصل کیے بغیر ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ پہلا بنیادی عنصر اسلامی عقائد ہیں جن کی وجہ سے اہل ایمان میں فکری استحکام پیدا ہوتا ہے۔ یہ فکری استحکام ایمان ویقین کی وجہ سے اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ صاحب ایمان کو ہر قسم کی فکری بے راہ روی سے محفوظ کر کے حق وصداقت کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ دوسرا بنیادی عنصر اخلاق و تزکیہ ہے۔ مکارم اخلاق کی تعلیم اور تزکیہ نفس انسان کے کردار، مزاج اور رویہ کی اصلاح کر کے اسے معاشرہ میں تہذیب وشائستگی کے اعلیٰ مقام پر فائز رکھتے ہیں۔

امت مسلمہ جب تک اپنے فقہی اور قانونی ورثہ سے وابستہ رہی اس وقت تک اس کی ترقی کی رفتار بھی تیز رہی اور عالمی قیادت میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے بہترین نمونہ بھی پیش کرتی رہی۔

لیکن جب مسلمانوں میں بنیادی عقائد کی تعلیم وتربیت کا نظام کمزور پڑ گیا اور اخلاقی اقدار میں ضعف پیدا ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور قانونی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ پھر استعماری دور میں اسلامی روایات، نظام تعلیم، قانون اور تہذیب وتمدن کو مٹانے کے لیے منظم کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں برصغیر میں ملک کے اسلامی عدالتی اور تعلیمی نظام کی جگہ استعمار کے اپنے نظام نے لے لی۔ اس صورت حال نے اس پورے خطہ کو بری طرح متاثر کیا اور بتدریج ہر شعبہ زندگی میں شر وفساد سرایت کرتا چلا گیا جس کے تباہ کن اثرات سے آج ہم دوچار ہیں۔

نحن قوم اعزنا الله بالا سلام ، وان ابتغينا العزة بغير ه اذلنا الله

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی، اگر ہم نے عزت کو اسلام کے علاوہ کسی اور نظام حیات میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔

لیکن آج مسلمانوں میں موجودہ صورت حال تبدیل کرنے کی تڑپ پائی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کی غیر اقوام کے قانون سے خود کو آزاد کرا کے قرآن وسنت کے نظام حیات میں دوبارہ عزت تلاش کریں۔ اسی تڑپ کے وہ مظاہر ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں عالم اسلام اور عالم کفر کے مابین کشمکش کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

امت مسلمہ کو ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جن کی جدید قانونی نظریات پر تنقیدی نظر ہو اور جو فقہ اسلامی کے اصل مآخذ سے استفادہ کرنے کی دسترس رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا احکام شریعت کی اکملیت، حقانیت اور ان کے قابل عمل ہونے پر غیر متزلزل ایمان اور ان احکام کو روبہ عمل دیکھنے کی حقیقی تمنا اور لگن بھی ہو۔

ایسے رجال کار کی تیاری میں شریعہ اکیڈمی' بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اپنے قیام کے روز اول سے مصروف عمل ہے۔ اس کام میں بیرون ملک کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی قانون دان طبقوں کے تربیتی پروگراموں کا انعقاد مسلسل جاری ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف وتالیف کے شعبہ میں فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ''سلسلہ مباحث فقہیہ'' کی تیاری اور اردو اور انگریزی زبانوں میں تراجم کا کام بھی ہو رہا ہے۔ شریعہ اکیڈمی کے تحت ''مطالعہ اسلامی قانون'' پر ایک ابتدائی کورس کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس ایک سالہ فاصلاتی کورس کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک ہزاروں افراد اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکے اور کر رہے ہیں۔

ہم نے اس ابتدائی کورس کے آغاز پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ''ایڈوانس کورس'' تیار کیے جا رہے ہیں اور جلد ہی ان کو شروع کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمارے عزم کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشا' ہماری راہیں آسان فرمائیں اور ہم اس قابل ہوئے کہ اصول فقہ (ISLAMIC JURISPRUDENCE) میں اختصاصی مطالعہ (ADVANCE COURSE) کا اجراء کر سکیں۔ فاصلاتی نظام کے تحت یہ اختصاصی مطالعہ چوبیس درسی اکائیوں (UNITS) پر مشتمل اور ایک سالہ دورانیہ کا ہے۔

اسلامی قانون میں دیگر اختصاصی مطالعہ جات کی تیاری کا کام جاری ہے ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اس نے جس طرح ہمیں اصول فقہ میں اس اختصاصی مطالعہ کو شروع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اسی طرح ہمارے دیگر منصوبوں کی تکمیل میں بھی فضل الٰہی شامل حال رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

پاکستان بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر قانون الٰہی کے غلبہ وقیادت کے لیے مطلوبہ رجال کار کی تیاری کسی ایک ادارے کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں امت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق کردار ادا کرنا ہے۔

ہم اہل علم سے ایسی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے منصوبوں کی بہتری میں ممد ومعاون ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تعارف

فقہ اسلامی کے تاریخی ارتقاء سے آگاہی اس ''اختصاصی مطالعہ'' کا ایک حصہ ہے۔ یہ اور اگلی دو درسی اکائیاں (units) اسی تاریخی ارتقاء سے بحث کرتی ہیں۔ ان میں آپ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، جعفری اور ظاہری فقہی مسالک کے اصولِ اجتہاد اور ترویج و اشاعت کے بارے میں پڑھیں گے۔

یہ فقہی مسالک ایک ہی منبع نور کی مختلف جوانب اور ایک ہی شجر سایہ دار کی مختلف شاخیں ہیں۔ یہ منبع نور اور شجر سایہ دار شریعتِ اسلامی ہے۔ یہ مختلف فقہی مسالک مسلمانوں میں وسعتِ فکر و نظر، قوتِ استدلال اور مذہبی رواداری کا آئینہ دار ہیں۔

موجودہ درسی اکائی فقہ حنفی اور فقہ مالکی سے متعلق ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو ان دونوں فقہی مسالک کے بانیوں، مشہور فقہاء اور ان کے اصول اجتہاد کے علاوہ ان مسالک کے ارتقاء و اشاعت سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوں گی اور اس سے آپ کا تعلق اپنے علمی فقہی ورثہ سے مضبوط ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فقہ حنفی

فقہ حنفی کے بانی

دوسری صدی ہجری کے ربع اوّل میں تدوین فقہ اسلامی کی ابتداء ہوئی۔ اس کام کا آغاز امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) نے کیا۔ ان کے فوراً بعد امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) نے بھی قرآن وسنت کی روشنی میں قوانین اسلام کو مرتب کیا۔ ان دونوں حضرات کے کچھ عرصے بعد امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) اور بعض دوسرے فقہاء نے بھی انہی خطوط پر کام کیا۔ اہل سنت میں چار اماموں کی فقہ رائج ہوگئی اور ان کے مستقل مسالکِ فقہ اور مکاتبِ فکر قائم ہوگئے۔ اہل سنّت کے باقی ائمہ کی فقہ اور ان کے مسالک مسلمانوں میں رائج نہ ہوسکے اور بتدریج متروک ہوگئے۔

اس مسلک کے بانی امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ ان کا نام نعمان بن ثابت ہے۔ آپ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے [۱]۔ کوفہ اس وقت عراق میں فقہاء کا مرکز تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم اور قاضی بنا کر وہاں بھیجا تھا۔

تمام ثقہ مورخین کہتے ہیں کہ امام صاحب کے والد صغر سنی میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت امیر المؤمنین نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔ امام صاحب کے دادا زوطی کبھی کبھی حضرت امیر المؤمنین کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب بجا لاتے۔

زوطی کی نسبت وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے۔ مؤرخین نے مختلف شہروں کے نام لکھے ہیں، لیکن قرائن اور دلائل کے بغیر کسی ایک شہر کو ترجیح دینا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ ان کا تعلق سرزمین فارس سے تھا اور وہ فارسی النسل تھے [۲]۔

۱۔ تاریخ بغداد ۱۳/۳۲۴

۲۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۳۹

اس وقت ان علاقوں میں بہت سے خاندان اور قبیلے اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ غالباً، زوطی اس زمانے میں اسلام لائے اور جوش وشوق میں عرب کا رخ کیا۔ حضرت علیؓ کا دور خلافت تھا اور شہر کوفہ کو دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل تھا، اسی شرف اور خصوصیت نے زوطی کو کوفہ میں طرحِ اقامت ڈالنے پر مجبور کیا۔

ابوحنیفہ کنیت رکھنے کی وجہ

تذکرہ نگاروں نے ابو حنیفہ کنیت رکھنے کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں۔ کسی نے کہا حنیفہ عراقی زبان میں دوات کو کہتے ہیں، چونکہ آپ کو قلم دوات سے گہرا لگاؤ تھا اس لئے ابوحنیفہ کنیت اختیار کی۔ لیکن یہ محض قیاس اور اٹکل کے تیر ہیں، حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ ان توجیہات کی راہ اس لئے کھلی کہ آپ کے کوئی بیٹی نہ تھی۔ صاحب ''الخیرات الحسان'' نے تصریح کی ہے کہ حماد کے سوا آپ کے کسی بیٹے یا بیٹی کا علم نہیں (۳)۔

امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں

امت محمدیہ میں سب سے بزرگ اور اعلیٰ مرتبہ صحابہؓ کا ہے جنہیں بارگاہِ خداوندی سے دائمی خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے۔ صحابہؓ کے بعد تابعین' اسلام میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ فرمان نبوی ہے: ''خیر الناس قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم'' یعنی بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں' اس کے بعد جو ان سے متصل ہیں اور پھر جو ان سے متصل ہیں۔ امام محی الدین نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور صحابہؓ کا زمانہ ہے، دوسرا دور تابعین کا اور تیسرا تبع تابعین کا'' (۴)۔

امام صاحب ۸۰ ہجری بمطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت تیس صحابہؓ بقید حیات تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف بھی نے کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے صحابہؓ کا زمانہ پایا ہے، حافظ عسقلانیؒ، علامہ ابن جوزیؒ، علامہ خطیب بغدادیؒ، علامہ ابن خلکانؒ اور علامہ ابن حجر مکیؒ جیسے ائمہ فن نے تسلیم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ جناب رسالت مآب کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کی زیارت سے کئی بار مشرف ہوئے ہیں (۵)۔

۳۔ الخیرات الحسان ص ۱۲

۴۔ شرح صحیح مسلم ۲/۳۰۹، ۳۱۰

۵۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۰/۱۰۷

حضرت انسؓ کی آمد و رفت کے علاوہ خود کوفہ میں امام صاحب کی پیدائش کے وقت نو صحابہؓ موجود تھے۔ علامہ ابن ندیمؒ اور علامہ ابن سعدؒ نے آپ کو تابعین کے طبقۂ پنجم میں شمار کیا ہے۔ اگر اختلاف ہے تو صرف اس بات میں کہ امام صاحب نے کسی صحابی سے روایت کی یا نہیں۔ بہر کیف تابعی ہونے کا شرف آپ کی قسمت میں تھا اور وہ آپ کو حاصل ہوا۔

علمی زندگی کا آغاز

حنفی مسلک کی ابتداء کوفہ سے ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی علمیت زندگی کا آغاز علم کلام سے کیا۔ کوفہ کے ممتاز فقیہ امام حماد بن ابی سلیمانؒ (م ۱۲۰ھ) سے فقہ پڑھی۔ عملی زندگی کے لحاظ سے آپ ریشمی کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ علمِ کلام میں مہارت اور پیشہ تجارت نے آپ میں عقل اور رائے سے مدد لینے، عملی اور کاروباری مشاہدات و تجربات سے فائدہ اٹھانے، شرعی احکام کو عملی زندگی میں جاری کرنے اور جدید مسائل میں قیاس واستحسان سے کام لینے کی بہترین صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

انتخابِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی احتیاط

علمی تبحر کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اقران میں ممتاز مقام پایا اور امام اعظم کہلائے۔ آپ انتخاب حدیث میں بہت محتاط تھے، صرف وہی حدیث لیتے تھے جو ثقہ ذریعہ سے ثابت ہو۔ اسی بناء پر بعض ناقدین نے یہاں تک کہا کہ امام ابوحنیفہؒ سے صرف سترہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے جس کی سرے سے کوئی اصل نہیں ہے۔

محدثین نے حدیث کے حوالہ سے امام ابوحنیفہؒ کی ایک تالیف ''مسند ابی حنیفہ'' کا ذکر کیا ہے جو احادیث و آثار کا مجموعہ ہے اور فقہی ترتیب پر مدون کیا گیا ہے۔ علماء نے اس کے بارے میں یہ بات کہی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنی مسند کو چالیس ہزار احادیث و آثار سے منتخب کیا ہے۔

بعض علماء نے اس کے بارے میں کہا کہ یہ کتاب امام ابوحنیفہؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کے تلامذہ نے فقہی مسائل کی طرح ان سے اخذ کر کے احادیث و آثار کو جمع کر دیا اور مہذب و مرتب کر کے فقہی ترتیب کے ساتھ کتابی شکل دے دی۔ انہی روایات کا اکثر حصہ جمع کر کے امام ابویوسفؒ نے اس کا نام ''الآثار'' رکھ دیا، نیز امام محمدؒ کی ''کتاب الآثار'' بھی اس نوع کی ہے کیوں کہ ان دونوں کتابوں کی مرویات عام طور پر ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں (۶)۔

۶۔ تذکرۃ الحفاظ ۱۵۹/۱

اگر یہ بات مان لی جائے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس مجموعہ کو خود مرتب نہیں کیا، تب بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ ان کے شاگردوں نے احادیث وآثار کو انہی سے اخذ کر کے کتابی صورت میں جمع کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے پاس احادیث وآثار کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ ان کے تلامذہ نے اس سے اخذ وانتخاب کر کے ایک مجموعہ مرتب کر لیا۔ اس سے منطقی طور پر اس بات کی نفی ہوگئی کہ امام ابوحنیفہؒ سے صرف سترہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے تو فقہی مسائل اور اپنے اجتہادات بھی خود کتابی شکل میں جمع نہیں کئے، وہ بھی ان کے لائق تلامذہ نے جمع کئے اور انہیں مرتب ومدون کیا۔ کیا اس بنیاد پر امام ابوحنیفہؒ کے فقیہ ومجتہد ہونے کا انکار ممکن ہے کہ انھوں نے مسائل فقہ یا اپنی آراء اور اجتہادات پر مشتمل کوئی کتاب تالیف نہیں کی؟ اگر فقہ میں کسی کتاب کے مرتب نہ ہونے کے سبب امام ابوحنیفہؒ کے فقیہ و مجتہد ہونے کا انکار ممکن نہیں ہے تو پھر حدیث میں کسی مجموعے کے مرتب مدوّن نہ ہونے کی وجہ سے ان کے محدّث ہونے کا انکار بھی مبنی برحقیقت نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رفقاء اور تلامذہ نے احادیث کے ایسے پندرہ مجموعے مرتب کئے جن میں جمع کردہ احادیث انہیں امام ابوحنیفہؒ سے پہنچی ہیں۔ ان مجموعوں کو قاضی القضاۃ محمد بن محمود خوارزمی (م ۶۵۵ھ) نے ایک جلد میں ''جامع المسانید'' کے نام سے جمع کیا ہے۔ بڑے بڑے محدّثین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کو جیسے علم کلام اور علم فقہ میں منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا، اسی طرح حدیث میں بھی ان کا درجہ اپنے اقران سے کم نہ تھا(۷)۔

امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) کے استاد مکی بن ابراہیمؒ (م ۲۱۵ھ) نے امام ابوحنیفہؒ سے استفادہ کیا اور ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے ''میں نے ابوحنیفہ کی خدمت میں رہ کر ان سے حدیث اور فقہ کا علم حاصل کیا اور بہت سی احادیث ان سے روایت کیں''(۸)۔

صحاح ستہ کے مرکزی راوی مسعر بن کدامؒ (م ۱۵۵ھ) علم حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی برتری کو بڑی فراخدلی سے تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں ''میں نے ابوحنیفہؒ کے ساتھ علم حدیث حاصل کیا لیکن وہ ہم پر غالب رہے۔ ہم نے ان کے ساتھ تحصیل فقہ کیا، اس میں انھوں نے جو کمال حاصل کیا اور مہارت پیدا کی وہ تم لوگوں سے مخفی نہیں''(۹)۔

۷۔ کردی، مناقب امام اعظم ۱/۲۰۳

۸۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱/۲۰۳

۹۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۰/۱۰۷

یہ بات امام ابوحنیفہؒ کے عہد اور مزاج کے عین مطابق تھی کہ تصنیف و تالیفِ کتب میں وقت صرف نہ کیا جائے۔ تالیفِ کتب کا دور امام صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں یا ان کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ صحابہؓ میں مجتہدین نے اپنے فتاویٰ اور اقوال و آراء کی تدوین پر توجہ نہیں کی بلکہ سنتِ نبوی تک کی تدوین سے گریز کرتے تھے۔ اور اس کا اصولی اور بنیادی سبب یہ تھا کہ اصول دین میں کتاب اللہ کے سوا کوئی دوسری کتاب مدوّن نہ ہونے پائے کیوں کہ قرآن ہی عمودِ شریعت، نورِ مبین اور حبل متین ہے۔ لیکن پہلی صدی گزر جانے کے بعد حالات نے مجبور کیا کہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کتابی صورت میں محفوظ و مدوّن کی جائے۔ چنانچہ فقہائے مدینہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور تابعین کے اقوال و فتاویٰ مدوّن کرنے شروع کیے اور پورے غور و فکر کے بعد انہی کو وہاں کے فقہاء نے اپنے اجتہاد و قیاس کی بنیاد بنایا۔

اہل عراق نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور قاضی شریحؒ (م ۸۷ھ) کے فتاویٰ اور فیصلوں کو بنیاد بنایا۔ امام ابراہیم نخعیؒ (م ۹۵ھ) نے ان حضرات کے فتاویٰ اور ان کے مبادیات کو ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے شیخ امام حمادؒ (م ۱۲۰ھ) کے پاس بھی اسی قسم کا مجموعہ تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مجموعوں کی حیثیت باقاعدہ کتب کی نہیں تھی بلکہ ان کی نوعیت یادداشتوں کی سی تھی۔ انہیں افادۂ عام کی غرض سے وسیع تر صورت میں متعارف نہیں کرایا گیا۔ البتہ فقہاء، مجتہدین اور عام اہل علم حسب ضرورت ان مرتبہ یادداشتوں سے استفادہ کرتے تھے۔ اس قسم کی یادداشتوں کا ثبوت صحابہؓ کے ہاں بھی ملتا ہے۔ تابعین کے دور میں یہ رواج پڑ گیا اور پہلی صدی گزر جانے کے بعد جب تدوین علوم کا دور شروع ہوا تو انہی مجموعوں کو سامنے رکھا گیا اور انہی کے طرز پر تالیف کتب کی ابتداء ہوئی (۱۰)۔

امام ابوحنیفہؒ نے فقہ میں کوئی کتاب تالیف نہیں کی

امام صاحب نے فقہ میں براہ راست کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن آپ کے تلامذہ نے آپ کے افکار، اقوال اور آراء کو پوری توجہ اور محنت کے ساتھ محفوظ و مرتب کیا۔ کبھی کبھی امام صاحب خود بھی املا کرا دیا کرتے تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے ان کی جملہ آراء اور فتاویٰ کو مدوّن کیا۔ اگرچہ وہ کلیۃً انہوں نے امام صاحب سے اخذ نہیں کیے کیوں کہ امام صاحب کے ساتھ ان کا زمانہ مصاحبت بہت مختصر ہے۔ البتہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے اقوال و آراء پر مشتمل دوسرے مجموعوں سے مدد لی اور بطور خاص امام ابوحنیفہؒ کے افکار و آراء اور اجتہادات کے ان تک پہنچنے کا سب سے بڑا ذریعہ امام ابو یوسفؒ بنے (۱۱)۔

۱۰۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۰۳

۱۱۔ حوالہ بالا ۱/۱۵۸

بعض روایات اس بات کی بھی نشان دہی کرتی ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ ان کے فتاویٰ' اجتہادات اور اقوال و آراء جمع کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات خود امام صاحب ان مدوّنات پر نظرِ ثانی کرادیتے تھے تاکہ ترمیم و اصلاح ہو سکے۔ مختلف روایات اور شواہد سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے امام صاحب کی طرف کتابوں کو منسوب کیا ہے یا یہ کہا ہے کہ انہوں نے فقہ کو مرتب کیا، ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ امام صاحب کے اقوال و آراء کو ان کے تلامذہ نے مرتب کیا۔

موفق بن احمد مکیؒ (م ۵۶۸ ھ) نے دعویٰ کیا ہے کہ علم شریعت کے سب سے پہلے مدوّن امام ابوحنیفہؒ ہیں، اس کا خیر میں کسی نے ان پر سبقت حاصل نہیں کی (۱۲)۔

امام ابوحنیفہؒ نے بنوامیہ کا آخری دور اور بنوعباس کا ابتدائی دور پایا۔ دونوں حکومتوں نے آپ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ پیش کیا لیکن آپ نے منظور نہ کیا۔ انہوں نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کی تکمیل میں حکومت کے عہدے قبول کرنا رکاوٹ بن سکتا تھا۔ آپ نے جس کام کی ابتداء کی تھی اس میں آزادیٔ فکر، آزادیٔ رائے اور خود داری بنیادی حیثیت کی حامل تھی اور آپ اسے مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے۔

قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہ کرنے کی پاداش میں آپ کو قید کی سزا دی گئی اور جیل ہی میں رجب ۱۵۰ ہجری میں آپ نے وفات پائی (۱۳)۔

امام ابوحنیفہؒ کے اصول اجتہاد

حقیقت یہ ہے کہ احکام کا استنباط اور ان کی تفریع تابعین بلکہ صحابہؓ کے زمانے ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا، اس کو کوئی خاص علمی شکل نہیں دی گئی تھی۔ جس طرح لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا کسی حکم کی تفریع محض وجدان اور ذوق کی بنیاد پر کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا استنباط یا تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت ہے اور اس کے کیا قیود و شرائط ہیں، فقہی مسائل کے احکام بھی اسی طرح مستنبط کئے جاتے تھے' نہ علمی اصطلاحات وضع ہوئی تھیں اور نہ اصول وضوابط منضبط ہوئے تھے۔

بنوامیہ کے آخری دور میں علمی اصطلاحات کا ظہور ہوا۔ چنانچہ واصل بن عطاء نے احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ ثبوتِ حق کے چار طریقے ہیں: ۱۔ قرآن ناطق، ۲۔ حدیث متفق علیہ، ۳۔ اجماع امت اور ۴۔ عقل و حجت یعنی قیاس۔ واصل نے اور بھی چند

۱۲۔ موفق' مناقب امام اعظم ۱/۹۵

۱۳۔ امام ابو حنیفة، حیاته و عصره (اُردو ایڈیشن) ص ۹۵

اصطلاحات وضع کیں مثلاً یہ کہ عموم وخصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں، نسخ صرف اوامر ونواہی میں ہوسکتا ہے اور اخبار وواقعات میں نسخ کا احتمال نہیں۔ ان مسائل کے لحاظ سے اصولِ فقہ میں اوّلیت کا فخر واصل کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ اسی قسم کی اوّلیت ہوگی جیسے علم نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے یہ کہا جانے لگا کہ علم نحو کے موجد حضرت علیؓ ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے زمانے تک جو کچھ ہوا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا۔ اس لیے استنباط اور استخراجِ احکام کے اصول اور قواعد وضوابط وضع کرنے پڑے۔

امام ابوحنیفہؒ کی علمی زندگی میں جو چیز سب سے عظیم اور قابل قدر ہے وہ اصول استنباط کا انضباط ہے جن کے سبب فقہ جواب تک جزئیات مسائل کا نام تھا، ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جن کو اصولِ فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے وضع کئے۔ یہ بات اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعیؒ سے پہلے یہ مسائل مربوط طریقے سے احاطۂ تحریر میں نہیں آئے تھے لیکن اصل فن کی بنیاد امام شافعیؒ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور اگر تحریر کی قید اٹھا دی جائے تو امام ابوحنیفہؒ اس کے موجد کہے جاسکتے ہیں۔

فقہی اصول وقواعد کو امام ابوحنیفہؒ نے وضع اور مربوط ومنظّم کیا۔ اور یہ بات کسی دلیل وبرہان کی محتاج نہیں کیوں کہ امام ابوحنیفہؒ نے جزوی اور فروعی مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لئے عقلی اور اجتہادی اَدِلّہ سے اس وقت کام لیا جب اکثر ائمۂ مجتہدین پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جزوی اور فروعی مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لئے عقلی اور اجتہادی اَدِلّہ کو اس حد تک وسعت دی کہ ان کے بعد آنے والے بھی ان کے نقش پا پر نہ چل سکے۔

امام ابوحنیفہؒ کے اصول اجتہاد کیا تھے؟ اس کی وضاحت خود انہوں نے بایں طور کی:

''میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر وہاں مسئلہ کا کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کرتا ہوں، اگر ان دونوں مصادر میں بھی حکم نہ ملے تو پھر اقوالِ صحابہؓ تلاش کرتا ہوں۔ جس صحابیؓ کا جو قول حسبِ موقع ہوتا ہے اسے لے لیتا ہوں، نہیں ہوتا تو چھوڑ دیتا ہوں۔ اقوالِ صحابہؓ کے دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ لیکن جب معاملہ صحابہؓ سے نکل کر ابراہیمؒ، شعبیؒ، ابن سیرینؒ، عطاء، اور سعید بن مسیّبؒ تک پہنچ جاتا ہے تو پھر بات یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اجتہاد کرتے تھے اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں''۔(۱۴)

''مناقب امام اعظم'' میں موفق مکیؒ لکھتے ہیں:

۱۴۔ تاریخ بغداد ۱۳/۳۶۸

''امام ابوحنیفہؒ کتاب اللہ کے بعد متفق علیہ حدیث کو تلاش کرتے۔ حدیث نہ ملتی تو قیاس سے کام لیتے۔ اس کے بعد استحسان کو کام میں لاتے۔ حلِ مسائل کے لئے جمہور مسلمین کے عرف اور تعامل سے مدد لینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ قیاس اور استحسان میں سے جو مصلحتِ عامہ کے لئے زیادہ مفید ہوتا اسے اختیار کرتے۔ لوگوں کے معاملات و مسائل پر ان کی گہری نظر تھی، وہ ہمیشہ ان کی سہولت اور فلاح کے جویا رہتے اور امکانی حد تک قباحت اور دشواری سے گریزاں رہتے''

موفق مکیؒ ہی کا کہنا ہے:

''امام ابوحنیفہؒ حدیث کے ناسخ و منسوخ میں انتہائی تفحص سے کام لیتے تھے۔ جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جاتی اس پر عمل کرتے۔ اہلِ کوفہ کی حدیثوں کو ان سے بڑھ کر پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سختی کے ساتھ حدیث کا اتباع کرنے والے تھے''(۱۵)۔

ابن عبدالبرؒ نے بھی اپنی کتاب ''الانتقاء'' میں امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں ایسا ہی کچھ نقل کیا ہے۔

ان تینوں وضاحتوں سے امام صاحب کے علم اور طرزِ استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تین روایتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جو امام صاحب کے مصادرِ فقہ کی نشان دہی کرتی ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق اور تناقض نہیں ہے۔

''تاریخ بغداد'' اور ''الانتقاء'' سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دلیل اوّل کتاب اللہ تھی، دلیل ثانی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دلیل ثالث اجماع صحابہؓ اور اختلافِ صحابہؓ کی صورت میں ان کے دائرہ اقوال میں رہتے ہوئے کسی ایک قول سے تمسک، جو ان کے نزدیک کتاب وسنت سے استنباط میں مطابقت رکھتا ہو اور قیاس سے مربوط ہو۔

دوسری تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی نص نہ ملتا تو قولِ صحابیؓ اختیار کرتے، وہ بھی نہ ملتا تو قیاس سے کام لیتے، پھر استحسان سے اور اس کے بعد لوگوں کے عرف وعادت کو بنیاد بناتے۔

ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے شہر میں جو فقہی تعامل رائج ہوتا اس کو بھی حل مسائل میں دلیل اور مأخذ کے طور پر استعمال کرتے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو فقہی دلائل اور مصادر قابل قبول اور قابل عمل تھے، وہ سات تھے:

۱- کتاب اللہ، ۲- سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۳- اقوالِ صحابہؓ، ۴- اجماع، ۵- قیاس، ۶- استحسان اور ۷- عرف و عادت۔

۱۵۔ موفق، مناقب امام اعظم ۸۲/۱

قرآن اور سنّتِ متواترہ سے ثابت حکم قطعی اور سنّتِ غیر متواترہ، جیسے خبر آحاد سے ثابت حکم ظنّی ہوتا ہے۔ قرآن اور سنّتِ متواترہ سے ثابت احکام فرض، اور سنّتِ غیر متواترہ سے ثابت اوامر میں سے بعض احکام واجب، بعض سنت مؤکدہ اور بعض مستحب ہوتے ہیں۔ جن احکام کی ممانعت دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ حرام اور جن احکام کی حرمت دلیل ظنّی سے ثابت ہو ان میں سے بعض مکروہ تحریمی (جس میں حرمت کا پہلو زیادہ ہو) اور بعض مکروہ تنزیہی (جائز مگر ناپسندیدہ) ہیں۔ ثبوت اور استدلال کے لحاظ سے سنّتِ غیر متواترہ کا درجہ قرآن اور سنّتِ متواترہ کے بعد ہوتا ہے اس لیے استدلال احکام میں اس مسلمہ فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

کیا امام ابوحنیفہؒ سنت پر قیاس کو ترجیح دیتے تھے؟

فقہاء کے درمیان یہ بحث بڑی معرکہ خیز رہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اجتہاد و استنباط میں سنت پر کس حد تک اعتماد کرتے تھے۔ بعض فقہاء نے ان کے بارے میں یہ بات کہی کہ وہ قیاس کو سنت پر مقدم رکھتے تھے۔

اس ضمن میں سب سے پہلی اور اصولی بات تو یہ ہے کہ خود امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اصول اجتہاد بیان کئے ہیں اور جن کا اجمالی ذکر ''تاریخ بغداد'' اور ''الانتقاء'' کے حوالے سے ابتدائی سطور میں ہو چکا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے واضح طور پر یہ بات کہی ہے کہ میں سب سے پہلے مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں دیکھتا ہوں، اگر اس میں نہ ملے تو پھر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ امام جعفر صادقؒ کو بھی یہی غلط فہمی تھی جسے امام ابوحنیفہؒ نے ان سے ملاقات کے وقت انتہائی عقلی اور مدلّل انداز سے رفع کیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس الزام یا غلط فہمی کی عام اور واضح انداز میں تردید کی اور فرمایا:

''اللہ کی قسم وہ لوگ دروغ گو اور افتراء پرداز ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم سنت پر قیاس کو مقدم سمجھتے ہیں جب نص موجود ہو، خواہ وہ قرآن سے ہو یا سنت سے تو پھر قیاس کی کیا ضرورت اور گنجائش باقی رہ جاتی ہے''(۱۶)۔

''ہم اس وقت تک قیاس سے کام نہیں لیتے جب تک شدید ضرورت لاحق نہ ہو جائے۔ زیر غور مسئلے میں سب پہلے کتاب و سنت سے رجوع کرتے ہیں پھر صحابہؓ کے اقوال، افتاویٰ اور فیصلے دیکھتے ہیں۔ جب وہاں بھی کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر قیاس سے کام لیتے ہیں''(۱۷)۔

۱۶۔ المیزان الکبریٰ ص ۵۱

۱۷۔ حوالہ بالا

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سنّت پر قیاس کو ترجیح دیتے تھے، غلط فہمی کا نتیجہ ہے کیوں کہ فقہاء میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیثِ آحاد کو حجت مانا ہے۔ اگر وہ کسی مرحلے پر قیاس کر لیتے اور بعد میں انہیں رائے کے خلاف کوئی حدیث مل جاتی، خواہ وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو، تو وہ اپنی رائے کو حدیث کے مطابق کر لیتے تھے۔

قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی "کتاب الآثار" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کس طرح بے جھجک احادیثِ آحاد کو قبول کرتے تھے، اپنی فقہ کے لئے انہیں کو بناء قرار دیتے، ان کے متن سے استدلال کرتے اور پھر اسی سے علل احکام کا استخراج کرتے تھے۔ فقہ امام ابوحنیفہؒ میں سنّت پر قیاس کو ترجیح دینے کی مثال تو کیا ملتی وہ تو صحابی کے قول، فتوے یا فیصلے پر بھی اپنی رائے کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ آئندہ سطور میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ سنّت کی حجیت کے اس حد تک قائل تھے کہ حدیث صحیح کے ذریعے کتاب اللہ کے کسی حکم میں اضافے کو جائز سمجھتے تھے، جیسے رجم کی سزا۔ قرآن حکیم میں حدِ زنا سو کوڑے بیان کی گئی اور اس میں یہ تخصیص اور تجزیہ نہیں تھا کہ شادی شدہ اور کنوارے کی ایک ہی سزا ہوگی یا جدا۔ بلکہ قرآن کے اجمال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ کوئی کنوارا ہو یا شادی شدہ، سب کی سزا رجم ہوگی۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس حدیث کی رو سے قرآنی حکم پر اضافہ کیا کہ جرم زنا کا ارتکاب کرنے والے اگر شادی شدہ ہوں گے تو ان کی سزا رجم ہو گی۔ دوسرے تمام فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ نے قیاس کو ترک کیا کہ روزہ دار اگر بھول کر کچھ کھالے یا پی لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور کہا کہ اگر یہ حدیث نہ ملتی تو میں قیاس سے کام لیتا (۱۸)۔

ابن امیر الحاجؒ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ دوسرے فقہاء کی طرح خبر واحد کو قیاس پر مقدم رکھتے تھے، قطع نظر اس سے کہ اس حدیث کا راوی فقیہ ہے یا غیر فقیہ، جیسا کہ ابھی ذکر کیا کہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا حالانکہ حضرت ابو ہریرہؓ کا شمار غیر فقیہ صحابہ میں ہوتا ہے (۱۹)۔

امام ابوحنیفہؒ نے کفارہ یمین کے روزوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کی بناء پر تتابع (پے در پے رکھنے) کی شرط لگائی۔ اس طرح کی کئی مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے حدیث متواتر یا حدیث مشہور کی بناء پر قرآنی احکام ونصوص پر اضافہ کیا ہے۔

۱۸۔ موفق، مناقب امام اعظم ۹۵/۱

۱۹۔ حوالہ بالا

اقوالِ صحابہؓ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا طرزِ عمل

صحابہ کرامؓ کے اقوال، فتاویٰ اور فیصلوں کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ موقف بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ سنّت کے بعد صحابہؓ کے اقوال اور فتاوی کو حجت مانتے ہیں اور صحابہؓ کے ہاں انہیں کوئی حکم مل جاتا تو قیاس سے گریز کرتے تھے۔ یہ صورتِ حال تو اس وقت تھی کہ کسی مسئلہ اور واقعہ کے بارے میں کسی ایک صحابی کا قول، فتویٰ یا فیصلہ ملے، لیکن ایک ہی مسئلہ کے بارے میں مختلف صحابہؓ کے اقوال مل جائیں اور ان میں باہم اختلاف ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا طریق کار انتہائی عقلی اور متوازن تھا۔ خلیفہ ابوجعفر منصورؒ نے امام صاحب کو لکھا کہ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے لکھا:

''وہ بات صحیح نہیں ہے جو امیر المومنین کو پہنچی ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ سے رجوع کرتا ہوں، وہاں مسئلہ کا حکم نہیں ملتا تو سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتا ہوں، وہاں بھی ناکامی ہوتی ہے تو خلفائے راشدینؓ کے فیصلے اور ان کی آراء دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد باقی صحابہؓ کے اقوال، فتاویٰ اور قضایا کو۔ صحابہؓ اگر کسی معاملے میں مختلف ہوں تو پھر بے شک میں قیاس سے کام لیتا ہوں''[۲۰]۔

امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت یہ ہے:

''جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو وہ سر آنکھوں پر، کسی صورت میں ہم سے اس کے خلاف سرزد نہیں ہوسکتا۔ رہے صحابہ کرامؓ کے اقوال اور قضایا، تو ان میں سے ہم بہتر کا انتخاب کریں گے۔ اس کے بعد معاملہ ہے تابعین اور تبع تابعین کے اقوال و فتاویٰ کا، تو بات یہ ہے کہ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں''[۲۱]۔

امام ابوحنیفہؒ قرآن، سنّت اور اقوالِ صحابہؓ کے فرقِ مراتب کو اس حد تک ملحوظ رکھتے ہیں کہ اگر انہیں ایک مسئلہ کے بارے میں دو مختلف اقوال ملیں، ان میں ایک قول خلفائے راشدینؓ میں سے کسی ایک کا اور دوسرا کسی عام صحابی کا تو وہ خلیفہ راشد کے قول کو اختیار کرتے ہیں اور عام صحابی کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر دو مختلف اقوال خلفائے راشدینؓ میں سے ہوں تو پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قول کو پہلے، حضرت عمر فاروقؓ کے قول کو دوسرے، حضرت عثمان غنیؓ کے قول کو تیسرے اور حضرت علیؓ کے قول کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ حضرت علیؓ کے قول کو حضرت عثمانؓ کے قول پر اور حضرت عمرؓ کے قول کو حضرت ابوبکرؓ کے قول پر ترجیح دے لیں۔

۲۰۔ المیزان الکبریٰ ۱/۵۲

۲۱۔ اصول البزدوی ۱/۲۱

استدلال اور استخراجِ احکام کے ضمن میں اس سے بہتر اور متوازن طریق کار کوئی نہیں ہوسکتا۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد حسن بن زیاد لؤلؤیؒ (م ۲۱۵ھ) کہتے ہیں :

''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نص ہوتے ہوئے یا اجماع کی صورت میں بھی یہ کہے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔ جس معاملے میں صحابہؓ کی آراء مختلف ہوتی ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب وسنّت سے کون سی رائے زیادہ قریب ہے، ہم اسی کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہیں۔ اجتہاد ان فقہاء پر حلِ مسائل کی راہیں کشادہ کرنے والا ہے جو اختلاف کی نوعیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ہمارے آئمہ اسی اصول اور بنیاد پر قیاس واجتہاد کرتے ہیں''(۲۲)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو اپنے بارے میں لوگوں کی افترا پردازیوں کا علم ہو چکا تھا، جن کی انہوں نے تردید کی اور خلیفہ منصورؒ کو جو خط لکھا اس میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔

ان وضاحتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک ہرگز نہ تھا کہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھا جائے۔ فقہائے مجتہدین میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں رہا کہ قیاس ظنّی کو حدیثِ صحیح پر ترجیح دی جائے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو بات منسوب کی گئی کہ وہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ وہ ہمیشہ کوفہ میں رہے، وہیں انھوں نے اپنی مجلس اجتہاد کی بنیاد رکھی' ان کے اجتہاد اور تدوین فقہ کا تمام عمل جو کم وبیش بائیس برس بعد پر پھیلا ہوا ہے، کوفہ میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اگر کسی حدیث کو نظر انداز کر کے قیاس کیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ حدیث ان تک یا کوفہ اور عراق کے اہلِ علم تک نہ پہنچی ہو، اگر پہنچتی تو وہ قیاس سے مدد نہ لیتے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حدیث موجود ہو اور امام ابوحنیفہؒ کو اس کا علم بھی ہو مگر وہ ان کی شرائط پر پوری نہ اترتی ہو۔ کیوں کہ حدیث کو قبول کرنے میں وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے فقہ کی اساس اور ڈھانچہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ اور قضایا پر اٹھایا۔ حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زندگی کا قابل ذکر حصہ کوفہ میں گزرا اور کوفہ ان حضرات کے علوم وفنون سے مالا مال ہوگیا۔

۲۲۔ مناہج الاجتہاد ص ۱۲۵

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اجتہاد وفتویٰ میں حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلتے تھے اور تابعین میں سے قاضی شریحؒ، علقمہؒ اور مسروقؒ نے ان بلند قدر فقہائے صحابہؓ کے اقوال وآراء کی خوب اشاعت کی تھی۔ نیز امام ابراہیم نخعیؒ نے ان تمام بزرگ ہستیوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ پھر امام ابراہیم نخعیؒ کے واسطہ سے ان بزرگوں کی علمی وراثت امام ابوحنیفہؒ کے شیخ امام حمادؒ کی طرف منتقل ہوگئی، جیسا کہ ان کے واسطہ سے امام شعبیؒ کی فقہ کا خزانہ ان کے ہاتھ لگ گیا جو اہلِ اثر کے مسلک سے زیادہ قریب تھا۔ امام حمادؒ پر امام نخعیؒ کا مسلک غالب رہا جو حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کی فقہ پر مشتمل تھا۔

جب امام ابراہیم نخعیؒ کی وساطت سے ان آئمہ ثلاثہ کی فقہ امام حمادؒ کی طرف منتقل ہوئی اور امام حمادؒ کے بعد امام ابوحنیفہؒ نے اس ورثہ کو سنبھالا تو لازمی طور پر نقدِ احادیث میں ان بزرگوں کا طرزِ فکر اور نقل روایت میں دقتِ نظر اور احتیاط کا خیال بھی ان کی طرف منتقل ہوگیا۔

اجماع کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اصولی طور پر اجماع تمام فقہاء کے نزدیک حجت اور قابل استدلال ہے۔ البتہ آئمہ اربعہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ کس قسم کا اجماع اور کن لوگوں کا اجماع حجت ہے؟ اس کی وضاحت آپ ہر امام کے اصولِ اجتہاد کی بحث میں پڑھ سکیں گے۔ یہاں امام ابوحنیفہؒ کا نقطۂ نظر پیش کیا جارہا ہے کہ وہ کس حد تک اجماع کو مصدرِ قانون کے طور پر تسلیم کرتے تھے۔

علمائے احناف کا کہنا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب ہر قسم کے اجماع کو حجت مانتے تھے۔ وہ جس طرح اجماعِ قولی کو معتبر مانتے تھے اسی طرح اجماع سکوتی کی حجیت کے بھی قائل تھے۔ بلکہ وہ اس بات کو بھی اجماع کے خلاف تصور کرتے تھے کہ کسی مسئلے میں علماء کے دو اقوال ہوں اور کسی دور میں بھی کسی صاحبِ علم نے ان سے اختلاف نہ کیا ہو اس کے بعد ایک شخص آئے اور ایک تیسرا مسلک اختیار کرے جو پہلے دونوں مسلکوں سے کسی طرح بھی مطابقت نہ رکھتا ہو۔

فقہائے احناف کے نزدیک اجماع سکوتی رخصت کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ اہلِ حل وعقد یا اہل اجتہاد میں سے کوئی شخص کسی مسئلے میں استقرار مسالک سے قبل ایک فتویٰ دیتا ہے اور اس فتویٰ کی شہرت کے باوجود کسی شخص کی طرف سے اس کی مخالفت ظاہر نہیں ہوتی اور تاویل کی مدت بھی گزر جاتی ہے۔ اجماعِ سکوتی عملی مسائل میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اہلِ اجماع میں سے ایک شخص ایک عمل کرتا ہے اور اس زمانے کے اہلِ علم اس عمل سے باخبر ہونے کے باوجود اس کا انکار نہیں کرتے۔ اس طرح تاویل وتفسیر کی مدت گزر جاتی ہے اور کسی حلقے سے اس کی مخالفت نہیں کی جاتی۔ اس طرح فقہائے احناف اجماع سکوتی کو حجت قرار دیتے ہیں۔ گو اس اجماع کی بنیاد کسی فعل پر کیوں نہ ہو، یعنی اس اجماع کے لئے قول کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

فخر الاسلام بزدویؒ لکھتے ہیں:

''تمام اہلِ علم کا کسی ایک مسئلے پر قولی طور پر اظہارِ اتفاق کرنا عادتاً بہت دشوار ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کبار اہلِ علم فتویٰ دیتے چلے جاتے ہیں اور دوسرے اہلِ علم اسے تسلیم کرتے جاتے ہیں اور کسی مسئلے کے سامنے آنے کے بعد اگر کوئی شخص سکوت اختیار کرتا ہے تو سکوت ہمارے نزدیک تسلیم کا قائم مقام ہے، کیوں کہ ایسے موقع پر اختلاف کے باوجود سکوت اختیار کرنا شرعاً حرام ہے''(۲۳)۔

فخر الاسلام بزدویؒ نے اجماع کی تفصیل کرتے ہوئے اس کے تین تدریجی مراتب قائم کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

۱- پہلے درجے میں اجماعِ صحابہؓ ہے اور یہ حدیث متواتر اور دوسرے قطعی دلائل کی طرح قطعیت کا فائدہ دیتا ہے۔ کیوں کہ صحابہ کرامؓ وہ ہیں جنھوں نے نزولِ وحی کا مشاہدہ کیا ہے اور وہ کلام اللہ کے اولین مخاطب ہیں۔

۲- دوسرا درجہ تابعین کے اجماع کا ہے جو کسی ایسے امر میں ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ اجماع حدیث مشہور یا مستفیض کا حکم رکھتا ہے جو ثبوت کے لحاظ سے تو ظنّی مگر عملاً قطعی ہوتی ہے۔

۳- تیسرے درجے میں تابعین کا اجماع کسی ایسے امر میں ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو۔ یہ اجماع احادیث (خبر واحد) کی قبیل سے ہوگا جو ہر لحاظ سے ظنّی ہوگا اور اس میں شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے(۲۴)۔

اجماع کے یہ تینوں درجے اس صورت میں ہیں جب وہ بطریق تواتر منقول ہوں، لیکن خبر! اجماع بطریقِ آحاد منقول ہو تو خواہ وہ اجماعِ صحابہؓ ہی کیوں نہ ہو، موجبِ یقین نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اجماعِ صحابہؓ بذاتِ خود قطعیت کا فائدہ دیتا ہے مگر جب وہ طریقِ آحاد سے منقول ہو تو اس پر ظنّیت غالب ہوگئی اور وہ احادیث آحاد کے درجے پر اتر آئے گا۔ جیسا کہ فرامینِ نبوی بذات خود موجبِ یقین ہوتے ہیں مگر جب وہ ہم تک طریقِ آحاد سے پہنچتے ہیں تو نقل کے بعد وہ ظنّی ہو جاتے ہیں۔ البتہ اجماع کسی صورت میں بھی ہو، قیاس پر بہر صورت مقدم ہوگا۔

قیاس واستحسان کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے مقدم رکھتے تھے۔ ان دونوں مصادر میں کوئی حکم نہ ملتا تو صحابہؓ کے فتاویٰ اور قضایا کی طرف دیکھتے تھے، وہاں سے بھی رہنمائی نہ ہوتی تو پھر قیاس اور اس کے بعد

۲۳۔ اصول البزدوی ۲/۲۴۲

۲۴۔ حوالہ بالا

استحسان کی طرف قدم بڑھاتے تھے۔ مگر اپنے اس اختصاص کو ہر مرحلے پر قائم رکھتے تھے کہ مصلحتِ عامہ اور دین میں رفعِ حرج کی اصل کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اسی اصل اور اساس پر پختگی نے انہیں قیاس سے ایک قدم آگے بڑھا کر استحسان پر مجبور کیا تھا۔ وہ جب قیاس کو لوگوں کے معاملات کے ساتھ ہم آہنگ نہ پاتے تو استحسان کو کام میں لاتے اور اس کی مدد سے مسائل کا حکم اخذ کرتے۔ قیاس اور استحسان سے کام لیتے وقت بھی ان کی نظر عرف و عادت اور عام لوگوں کے تعامل پر ہوتی تھی اور اپنے اجتہاد میں وہ امکانی حد تک اسے بھی پیش نظر رکھتے تھے۔

حنفی مسلک کی ترویج و اشاعت

حنفی مسلک کی داغ بیل کوفہ میں پڑی، وہیں یہ پروان چڑھا۔ ۱۵۰ ہجری میں امام ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ اور حلقہ کے علماء نے اس کی تعلیم و تدریس کا آغاز کیا۔ بغداد فقہ حنفی کی تعلیم و اشاعت کا اوّلین مرکز بنا۔ اس کے بعد اس کی اشاعتِ عام شروع ہوئی اور مسلم دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں اس کی پیروی شروع ہوگئی۔

فقہ حنفی کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ اس کے قبولِ عام میں حکومت اور اقتدار کے سہارے کو بہت بڑا دخل ہے۔ کیوں کہ اس کے سب سے اہم رکن قاضی ابو یوسفؒ خلافتِ عباسیہ میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز کئے گئے، انہوں نے حنفی مسلک کی سرپرستی کی۔

حنفی مسلک کی ترویج و اشاعت اور عالم اسلام میں اس کی قبولیت کے اسباب، حکومت و اقتدار کے اثر و رسوخ اور اس کی سرپرستی سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہیں۔ باقی تین آئمہ مجتہدین کے مسالک کی اشاعت اور قبولیت کی بنیادی وجہ اس کی ذاتی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مسلک زیادہ تر وہیں پھیلا جہاں وہ اقامت پذیر رہے۔ امام ابو حنیفہؒ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں تھی کہ ان کی علمی زندگی مرکزِ نبوت (مدینہ منورہ) میں گزری ہو جیسا کہ امام مالکؒ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ ان کی پوری زندگی مرکزِ نبوت میں گزری۔ وہاں کے فقہاء اور محدثین سے انہوں نے استفادہ کیا، عالم اسلام کے ہر علاقے سے اہلِ علم مدینہ منورہ آتے اور امام مالکؒ کے علم و فضل سے روشناس ہوتے تھے۔ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا موقع ملتا تھا۔ امام مالکؒ بھی ان سے تبادلہ افکار و خیالات کرتے تھے۔ آج کی دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی ماہر فن اپنے ملک کے مرکزی شہر میں بیٹھ کر جو کام کر سکتا ہے وہ کسی دوسرے یا تیسرے درجہ کے شہر میں بیٹھ کر کرنا ممکن نہیں ہوتا اور کسی ماہر فن کی اپنی حیثیت بھی صحیح معنی میں مرکزی جگہ میں ہی اجاگر ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اس خصوصیت سے محروم تھے۔

کسی اہم اور غیر معمولی کام کی انجام دہی میں خاندانی پس منظر بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ فضیلت امام شافعیؒ کو حاصل

تھی۔ وہ ہاشمی النسب ہونے کے ساتھ ساتھ عربی النسل بھی تھے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ عربی النسل تھے مگر امام ابوحنیفہؒ کو ان میں سے کوئی فضیلت اور امتیاز حاصل نہ تھا۔ نہ وہ قریشی یا ہاشمی النسب تھے اور نہ عربی النسل، حتی کہ ان کے خاندان میں کوئی عالم بھی نہ تھا۔ نہ کوئی ایسا شخص تھا جو مسلم معاشرے میں کسی غیر معمولی حیثیت کا حامل ہوتا۔ ان کے اجداد میں کوئی سیاسی اثر ورسوخ کا مالک بھی نہ تھا۔ آپ کا آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تمام عمر اس پیشہ سے وابستہ رہے اور کاروبار کے ذریعے کسب معاش کیا، آباؤ اجداد ایران سے آکر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت علیؓ کا دور خلافت تھا۔ جو اہلِ علم رائے اور اجتہاد کے مقابلہ میں ظاہر حدیث پر عمل کو ترجیح دیتے تھے وہ ان کے سخت خلاف تھے اور سیاسی سطح پر حکومتِ وقت سے ہمیشہ ان کا ٹکراؤ رہا چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ انہیں حکومتِ وقت کی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس کے زیر سایہ ان کا مسلک پروان چڑھا۔ غرض حسنِ قبول اور اشاعتِ عام کے لئے جتنے خارجی اسباب اور محرکات ہو سکتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ ان سب سے محروم تھے۔ اس کے باوجود ان کا مسلک صرف اس علاقے میں محدود نہیں رہا جہاں وہ اور ان کے تلامذہ اقامت پذیر رہے اور جہاں اس مسلک کی ترتیب وتدوین عمل میں آئی بلکہ یہ دنیائے اسلام کے اکثر حصوں میں پھیل گیا۔ تیسری صدی ہجری ہی میں حنفی مسلک عراق سے نکل کر شام، مصر، روم، ماوراء النہر، ایران حتی کہ ہندوستان اور چین کے حدود بھی پھاند گیا (۲۵)۔

امام ابوحنیفہؒ کا دور خلافتِ عباسیہ کا دور تھا۔ خلفائے عباسیہ اگرچہ خود اجتہاد کے دعویٰ دار تھے مگر دعویٰ اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ محض دعویٰ پر اگر عمارتیں کھڑی کی جاسکیں تو ہر شخص کچھ نہ کچھ کر گزرے۔ خلفائے بنی عباس اپنے تمام دعووں کے باوجود اس بات پر مجبور ہوئے کہ حنفی مسلک کو اپنی قلمرو میں قانون حکومت کی حیثیت سے نافذ کریں۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ خلیفہ ہارون الرشیدؒ کے عہد میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ ۱۷۰ھ کے بعد وہ قاضی القضاۃ بن گئے۔ بعض لوگوں نے تو کہا کہ امام ابو یوسفؒ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بننے کی وجہ سے خلافتِ عباسیہ میں مذہب حنفی کو فروغ حاصل ہوا، لیکن یہ بات حقیقت سے بہت مختلف ہے، خلافت عباسیہ کی نظر میں امام ابوحنیفہؒ ایک پسندیدہ شخصیت نہیں تھے۔ ان کے ساتھ حکومت کا جو سلوک رہا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پھر یہ کہنا کہاں تک بجا ہے کہ حنفی فقہ خلفائے عباسیہ کی سرپرستی کے سبب پھیلا۔ ایک ایسی وسیع حکومت کے لئے جس کے حدود عراق وحجاز سے افریقہ کے شمال اور ایشیا کے وسط تک پھیلے ہوئے تھے، حنفی مسلک کو اپنانے کی بنیادی وجہ اس کی جامعیت اور اس کا عقلی اور اجتماعی انداز فکر تھا۔ ان کے ایک شاگرد امام (ابو یوسفؒ) کو چیف

۲۵۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱۳۲/۲

جسٹس کے اعلیٰ اور اہم منصب پر فائز کرنے کی تہ میں بھی یہی حقیقت کارفرما تھی کہ اس وقت وہی اس منصب کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ ٹیکس اور مال گزاری سسٹم پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ''کتاب الخراج''، لکھ کر انھوں نے اپنی اعلیٰ ترین اہلیت کا ثبوت دیا۔ پوری خلافت عباسیہ میں حنفی مسلک کا اثر ورسوخ اس حد تک بڑھا کہ جب خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہوا اور حکومت کمزور پڑی اور بالآخر ایک وقت اس کا شیرازہ بکھر گیا تب بھی اس کا اثر ونفوذ برابر قائم رہا بلکہ اسے مسلسل فروغ حاصل ہوتا رہا۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں جب شافعی مسلک کی بنیاد بڑی تو اگر چہ اس کا اوّلین گہوارہ بھی بغداد تھا مگر فقہ حنفی پر غالب نہ آسکا۔

ابن فرحونؒ کا بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک حنفی مسلک افریقہ کے اکثر مسلم علاقوں میں پھیل چکا تھا حتی کہ افریقہ کے حدود سے نکل کر اندلس میں بھی داخل ہوگیا تھا[۲۶]۔

امام شافعیؒ کا آخری زمانہ مصر میں گزرا اور وہیں ان کی فقہ پھلی پھولی مگر اس کے باوجود حنفی مسلک وہاں باقی رہا اور عرصہ تک یہ دستور رہا کہ چار قاضی مقرر ہوتے تھے، ایک حنفی، ایک مالکی، ایک شافعی اور ایک حنبلی مگر سربراہی حنفی کے پاس رہتی تھی۔ یہ صورت حال اس وقت تک قائم رہی جب تک مصر پر فاطمی خاندان قابض نہیں ہوا، فاطمی خاندان کی حکمرانی کے بعد شیعہ مسلک کو سرکاری مذہب کی حیثیت دے دی گئی۔

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد جن خاندانوں کو عروج حاصل ہوا ان میں اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوقی جس نے طویل مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرہ حکومت کی وسعت ایک طرف کاشغر سے بیت المقدس تک اور دوسری سمت میں قسطنطنیہ سے لے کر بلاد خزر تک پہنچی ہوئی تھی، حنفی المسلک تھا[۲۷]۔

مغلوں کے بعد برصغیر ہند میں جو خاندان برسر اقتدار آئے ان میں اکثر حنفی تھے۔ سلطان محمود غزنویؒ جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے، فقہ حنفی کے بہت بڑے عالم تھے، فقہ حنفی پر ان کی ''کتاب التفرید''، مشہور ہے۔ سلطان نورالدین زنگیؒ تاریخ اسلام کا ایک روشن ستارہ ہے۔ وہ اور ان کا تمام خاندان حنفی مسلک کا پیروکار تھا۔ سلطان زنگیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مناقب میں ایک کتاب بھی لکھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ خود شافعی مسلک کے حامل تھے مگر ان کے خاندان کے اکثر لوگ حنفی تھے۔ چرکسی خاندان جس نے مصر پر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی، حنفی المسلک تھا۔ ہندوستان میں آل تیمور کا یہی مسلک تھا[۲۸]۔

۲۶۔ ابوحنیفہ حیاتہ وعصرہ ص ۷۰۳ ومابعد

۲۷۔ حوالہ بالا

۲۸۔ دائرہ معارفِ اسلامیہ ۷۸۴/۱

سلطنت عثمانیہ کا سرکاری مذہب یہی تھا۔اسی کی روشنی میں "مجلة الاحكام العدلية" کی تدوین ہوئی۔ برصغیر ہندوستان میں شہنشاہ عالمگیرؒ کے عہد حکومت میں "فتاویٰ ہندیة" کے نام سے فقہ حنفی کے مطابق قاضیوں اور مفتیوں کی رہنمائی کے لئے ایک عمدہ اور ضخیم کتاب مرتب ہوئی جو "فتاویٰ عالم گیری" کے نام سے مشہور ہے[۲۹]۔

جزوی طور پر حنفی مسلک اسلامی دنیا کے ہر حصے میں موجود ہے مگر ترکی، افغانستان، پاکستان، ہند، بنگلہ دیش، چین، روسی ترکستان اور برما کے مسلمانوں کی غالب اکثریت حنفی مسلک کی پیروکار ہے۔ابتداء میں ایران کے تمام علاقے میں حنفی مسلک چھایا ہوا تھا، بعد میں حکومتی اثر ورسوخ کے ذریعے شیعہ مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔لیکن اس وقت بھی شیعہ مسلک کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ پیروکار حنفی مسلک کے ہیں اور ایران کی تقریباً تمام سنی آبادی حنفی المسلک ہے۔ بقول استاذ محمد ابوزہرہ، حنفی مسلک مشرق ومغرب میں ہر جگہ موجود ہے، اس کے پیروکاروں کی تعداد حد شمار سے زیادہ ہے[۳۰]۔ بلاخوف وتردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت پوری دنیا کے سنی مسلمانوں میں دو تہائی حنفی مسلک کے پیروکار ہیں۔ باقی ایک تہائی آبادی میں تینوں فقہی مسالک (مالکی، شافعی اور حنبلی) کے ماننے والے ہیں۔

اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ کم وبیش یہی تناسب اور صورت حال اہل سنت کے چاروں فقہی مسالک کے ظہور اور ترویج و اشاعت کے بعد سے آج تک قائم ہے۔

فقہ حنفی کی ترویج واشاعت کا اوّلین ذریعہ امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں سے بطور خاص حسب ذیل اصحاب بنے:
امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ)، قاضی ابویوسفؒ (م ۱۸۲ھ)، یحیی بن زکریا بن ابی زائدہؒ (م ۱۸۴ھ)، یحیی بن سعید القطانؒ (م ۱۹۸ھ) اور وکیع بن الجراحؒ (م ۱۹۷ھ)[۳۱]۔

بعد کے ادوار میں جن اہل علم وفضل نے تصنیف وتالیف کے ذریعے فقہ حنفی کو نہ صرف زندہ رکھا اور اس کی ترویج واشاعت کا ذریعہ بنے بلکہ اسے اوج کمال تک پہنچایا ان میں حسب ذیل حضرات بہت نمایاں ہیں:

۲۹۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱/ ۴۶، ۱۲۸

۳۰۔ ابوحنیفہ حیاتہ وعصرہ (اردو ایڈیشن)

۳۱۔ الفقہ الاسلامی ص ۱۳۲، ۱۳۳

ابوبکر محمد بن احمد سرخسیؒ (م۴۹۰ھ) مصنف المبسوط، ابوبکر بن مسعود بن احمد علاء الدین کاسانیؒ (م۵۴۰ھ) مولف بدائع الصنائع، برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانیؒ (م۵۹۳ھ) مولف الھدایۃ، حافظ الدین نسفیؒ (م ۷۱۰ھ) مولف کنز الدقائق، محمد بن عبدالواحد کمال الدین شہیر بابن ھمامؒ (م۸۶۱ھ) صاحب فتح القدیر، محمود بن احمد بدرالدین عینی (م۸۵۵ھ) مولف رمز الحقائق شرح کنز الدقائق، فخرالدین عثمان بن علی زیلعیؒ (م۷۶۲ھ) مولف تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، زین العابدین بن ابراہیم بن محمد بن نجیمؒ (م۹۷۰) مولف الاشباہ والنظائر، محمد بن اعلی حصکفی دمشقیؒ (م۱۰۸۸ھ) مولف درمختار، سید محمد امین ابن عمر عابدین (م۱۲۵۲ھ) مولف ردالمحتار معروف فتاویٰ شامیۃ.

فقہ مالکی

فقہ مالکی کے بانی

فقہ مالکی کے بانی کا نام مالک اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ امام دارالہجرہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو بن حارث (۳۲)۔

یمن کے آخری شاہی خاندان حمیر کی شاخ ''اصبح'' سے آپ کا تعلق تھا۔ یمن میں آپ کا خاندان دورِ جاہلی اور دورِ اسلام دونوں میں معزز ومحترم رہا۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا حضرت ابوعامرؓ مشرف بااسلام ہوئے۔ بعض روایات کی بناء پر اس شرف اندوزی کی تاریخ خاصی قدیم ہے یعنی سنہ ۲ ہجری۔ قاضی ابوبکر بن العلاءؒ کا کہنا ہے کہ حضرت ابوعامرؓ غزوہ بدر کے علاوہ دوسرے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔

محدثین اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ محدث ذہبیؒ کہتے ہیں کہ ''میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے امام مالکؒ کے پردادا حضرت ابوعامرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں شمار کیا ہو (۳۳)۔ البتہ امام مالکؒ کے دادا حضرت مالک بن ابی عامرؓ کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ تابعی تھے اور صحاح ستہ کے راویوں میں داخل ہیں۔ حضرت عثمانؓ سے ان کو ایک گونہ تعلق تھا۔ چند سربکف نوجوانوں اور مخلصوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے جسد کو باغیوں اور دشمنوں کے قبضے سے نکال کر دفن کرنے کی خدمت انجام دی تھی، ان میں یہ بھی تھے۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں افریقہ میں جو جنگیں لڑی گئیں ان میں بھی انھوں نے حصہ لیا (۳۴)۔ روایتِ حدیث میں انہیں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت عائشہؓ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ ''الموطأ'' میں بھی ان کی روایت سے حدیث ہے۔ امام نسائیؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ ان کی علمی ودینی بصیرت اور سیاسی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے دورِ حکومت میں

۳۲۔ تنویر الحوالک ۱/۶

۳۳۔ تذکرۃ الحفاظ

۳۴۔ حیات مالک ص ۱۴

بعض اہم سرکاری معاملات میں ان سے مشورے لیا کرتے تھے۔ طویل عمر پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا سال وفات ۱۰۴ ہجری ذکر کیا ہے(۳۵)۔

پیدائش، نشوونما

امام مالکؒ کے سن پیدائش میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم نے ۹۳ھ کو اختیار کیا ہے کیوں کہ یہ تاریخ امام مالکؒ کے خاص شاگرد یحییٰ بن بکیرؒ کی بیان کردہ ہے جو برسوں امام صاحب کی خدمت میں رہے(۳۶)۔

حلیہ اور لباس

تذکرہ نگاروں نے امام مالکؒ کا حلیہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے: دراز قد، بھاری جسم، رنگ سفید سرخی مائل، آنکھیں بڑی، خوبصورت، اونچی اور ستواں ناک، پیشانی میں سر کے بال کم تھے۔ ایسے شخص کو عربی میں اصلع کہتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اصلع تھے۔ داڑھی گھنی اور لمبی، مونچھوں کے ان بالوں کو جو لبوں کے کناروں پر ہوتے ہیں، کتر واتے تھے۔ مونچھیں مڈوانے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ فرماتے کہ مونچھ کا مڈوانا مثلہ کرانے کے مترادف ہے، مونچھیں بھی ذرا لمبی رکھتے۔ اس میں حضرت عمرؓ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب کوئی مشکل درپیش ہوتی اور کسی اہم معاملے میں سوچ بچار کرتے تو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا کرتے تھے۔

بڑھاپے میں کبھی بالوں میں خضاب نہیں کیا۔ بہت خوش پوشاک تھے۔ لباس کے معاملے میں امام صاحب کا ذوق اتنا نازک اور بلند تھا کہ موٹے جھوٹے کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ اکثر سفید رنگ کا لباس پہنتے اور بہترین خوشبو استعمال کرتے، کوئی اس اہتمام کا سبب پوچھتا تو جواب دیتے کہ جس شخص کو اللہ نے فراخی عطا کی ہو اور اپنا مال و دولت دیا ہو کہ وہ اچھا کھا سکے اور اچھا پہن سکے تو اس کو ضرور اپنے آپ کو باوقار طریقہ سے رکھنا چاہئے۔ جس شخص پر اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت کا اثر ظاہر نہ ہو تو اللہ ایسے آدمی کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ اس نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپا کر کفران نعمت کیا ہے۔

امام مالکؒ کا شمار عباد زمانہ میں تھا۔ درس حدیث اور افتاء سے جو وقت فارغ ملتا وہ نوافل اور تلاوت کلام پاک میں صرف ہوتا۔ کسی نے ان کی بیٹی سے پوچھا: امام صاحب کی گھر میں کیا مصروفیات ہیں تو انھوں نے جواب دیا: نوافل اور تلاوتِ قرآن، جمعہ کی پوری رات عبادت الٰہی میں گذرتی ہے۔

۳۵۔ حوالہ بالا

۳۶۔ حوالہ بالا ص ۴۰

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات سے، اپنے ماں باپ سے اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ جس کو جس درجہ ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگی اس کا اسی درجہ کا ایمان ہوگا۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو جس درجے کا مومن ہوگا اس کو ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی۔

امام مالکؒ ایمان کے بھی اعلیٰ درجے پر فائز تھے اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان کے رتبے کو پالینا بہت دشوار تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب حضور کا نام مبارک زبان پر آتا تو چہرہ کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن نفوس قدسیہ کی زیارت کی ہے ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی۔

مدینہ میں کبھی سوار ہوکر نہیں چلتے تھے۔ لوگ وجہ دریافت کرتے تو فرماتے ''جن گلی کوچوں سے اور جن جن جگہوں سے حضور اقدس گزرے ہوں اور وہاں آپ کے پائے مبارک رکھے گئے ہوں، مجھے شرم آتی ہے کہ میں ان مقامات سے کسی سواری پر سوار ہوکر گزروں۔'' سواری پر سوار ہوکر گزرنا تو بڑی بات ہے، حضور کے ادب واحترام کی یہ کیفیت تھی کہ مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں جوتے پہن کر بھی نہیں نکلتے تھے۔

حدودِ حرم میں قضائے حاجت نہ کرتے، حرم سے باہر نکل جاتے اور وہاں بھی یہ حالت ہوتی کہ چہرے کا رنگ پیلا پڑ جاتا، خوف سے کانپنے لگتے اور فرماتے کہ ''مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں جس جگہ قضائے حاجت کے لئے بیٹھا ہوں یہاں کسی صحابی کا جسد مبارک دفن نہ ہو اور مجھ پر اللہ کا عذاب نازل ہوجائے۔'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے امام مالکؒ پر عجیب کیفیت طاری کردی تھی۔

جس کمرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ انور ہے اس کے قریب لوگوں کو اونچی آواز سے بولنے نہ دیتے اور فرماتے ''یہ آستانۂ نبوت سے گستاخی ہے'' اور یہ آیت پڑھ کر سناتے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (الحجرات ۴۹:۲)

اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو اور آپ سے تڑخ کر نہ بولو جیسے تڑختے ہو ایک دوسرے پر، کہیں تمہارے سارے اعمال اکارت نہ ہوجائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

علمی زندگی کا آغاز

امام مالکؒ نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کے آغوش میں پایا۔ خود گھر اور گھر سے باہر تمام شہر اہلِ علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بہت سے صحابہؓ مدینہ سے نکل کر دوسرے شہروں اور علاقوں میں چلے گئے تھے لیکن کہتے ہیں کہ معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن رہتا ہے۔ عہد نبوی میں اور پھر عہد نبوی کے بعد بھی مدینہ پچیس برس تک خلافتِ راشدہ اور اسلامی ریاست کا مرکز رہا۔ اکابر صحابہؓ جو علومِ قرآن و سنت کے حامل و امین تھے، نے اسی شہر میں زندگی بسر کی، یہیں سنت نبوی کی خدمت کی اور یہیں سے یہ نور اطراف و اکناف میں پھیلا۔ یہیں سے احکام و فتاوی، فقہائے صحابہؓ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جن مسائل میں اجماع ہوا، اس کا شرف بھی مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ اس اجماع میں فقہائے مدینہ کی حیثیت بنیادی پتھر کی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جو اسرارِ شریعت کے راز داں تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و سنن کا متبع اور واقف کون ہو سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو خیر امت تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے بڑھ کر حدیث کا کوئی راوی اور حافظ نہ تھا، حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی تھے، ان سب کی درس گاہیں مدینہ میں آباد تھیں جہاں دور دور سے لوگ آ کر وحی و سنت کا علم حاصل کرتے تھے۔

ان اکابر کے علاوہ جن کا علم مدینہ سے پھیلا، ان میں مکتب صدیقؓ کے وارث حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ اور حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے بیٹے حضرت عروہؒ، مسند فاروقؓ کے جانشین حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے داماد حضرت سعید بن مسیبؒ بہت نمایاں ہیں۔ امام مالک انہی بزرگوں کے علمی وارث بنے۔

امام مالکؒ کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بعض دوسرے فقہاء اور محدثین کی طرح مختلف شہروں اور علاقوں کے سفر نہیں کیے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ نے حصولِ علم کی خاطر بہت زیادہ سفر کیے۔

امام مالکؒ کی ساری زندگی مدینہ میں گزری۔ وہ صرف ایک بار مدینہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر گئے اور وہ بھی فرض حج کی ادائیگی کے لئے، لیکن ان کے ایک ہی شہر میں رہنے سے ان کے حصولِ علم پر کوئی اثر نہیں پڑا، کیوں کہ جن لوگوں نے مختلف شہروں اور علاقوں کا سفر کیا تو اس لئے کہ وہ سفر نہ کرتے تو صرف انہی اہل علم و فضل سے استفادہ کر سکتے جو ان کے شہر میں تھے اور اس طرح وہ علم و فضل کے ان خزانوں سے محروم رہتے جو دوسرے شہروں میں محفوظ تھے۔ امام مالکؒ کا معاملہ ان حضرات سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی پیدائش، نشو و نما اور قیام مدینہ میں رہا۔ مدینہ کو یہ فخر اور امتیاز حاصل تھا کہ وہاں تمام عالم اسلام کے علماء اور فضلاء آتے رہتے تھے اور بطور خاص حج کے مہینوں میں۔ بیت اللہ کی حاضری کے بعد روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کا شرف اور جذبہ ہر ایک کو وہاں کھینچ لاتا تھا۔ جس کا اپنا گھر اور شہر لعل و جواہر کی

کان ہو اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے (۳۷)۔ یہی حال امام مالکؒ کا تھا۔ انہوں نے مدینہ میں رہتے ہوئے بھی نہ صرف حجاز بلکہ شام، عراق اور مصر کے علماء، فقہاء اور محدثین سے بھرپور استفادہ کیا۔

مکتبِ صدیقؓ کے وارثوں اور مسند فاروقؓ کے جانشینوں کے علاوہ مدینہ میں چند اور ممتاز علماء اور مشاہیر بھی تھے۔ مثلاً امام ہشام بن عروہؒ، امام محمد بن منکدرؒ، امام عبیداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہریؒ، امام عامر بن عبداللہؒ۔ امام جعفر صادقؒ، امام ربیعہ الرائی، امام ابوسہیلؒ، امام نافع بن مالکؒ اور امام سلیمان بن یسارؒ وغیرہ۔ یہ وہ حضرات تھے جن کی خداداد صلاحیت، محنت اور فضل وکمال کی بدولت دینی علوم نے غیر معمولی ترقی کی (۳۸)۔

یہ تھا گھر اور شہر کا وہ ماحول جس میں امام مالکؒ نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے، تعلیم وتربیت پائی اور پھر دنیائے اسلام کے محدث کبیر، فقیہ اور مجتہد بنے۔

حفظِ قرآن

دینی تعلیم کا سب سے پہلا مرحلہ حفظِ قرآن ہے۔ اس کے بعد تجوید کا مرحلہ آتا ہے۔ امام مالکؒ نے پہلے قرآن کریم حفظ کیا، اس کے بعد امام نافع بن عبدالرحمانؒ (م ۱۶۹ھ) سے عرضاً قراءت سیکھی یعنی امام مالکؒ پڑھتے تھے اور وہ سنتے تھے۔ امام مالکؒ نے حروفِ قرآنی کی ادائیگی میں مہارت حاصل کی۔ امام نافعؒ ان سات قاریوں میں سے ایک ہیں جن کی قراءت کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے یہ تجوید وقراءت میں اہلِ مدینہ کے امام تھے (۳۹)۔

علمِ حدیث کی طرف توجہ

حفظ قرآن اور علم تجوید وقراءت کے حصول کے بعد امام مالکؒ حصول علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ مدینہ تو علم وحکمت کا چمن زار تھا ہی، امامؒ نے خود اپنے گھرانے کو علم کی طرف رغبت دلانے والا پایا۔ گھر والوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ علماء کی مجلسوں میں جائیں اور ان سے علم وادب حاصل کریں۔ والدہ نے یہ بات سنی تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے امامؒ کو نئے کپڑے پہنائے، سر پر عمامہ باندھا اور فرمانے لگیں: جاؤ، ابھی ربیعہ کے پاس جاؤ اور ان سے علم سیکھو (۴۰)۔

۳۷۔ مالک حیاتہ وعصرہ ص ۲۷، ۲۸

۳۸۔ حوالہ بالا

۳۹۔ حوالہ بالا

۴۰۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۰۸

امام مالکؒ کے بعض ہم عصر کہتے ہیں کہ ''جب ہم نے امام مالکؒ کو ربیعہ الرائیؒ کے حلقہ درس میں دیکھا تو وہ بہت چھوٹے تھے اور ان کے کان میں بالی تھی''۔ اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ امام مالکؒ نے بچپن ہی میں حصول علم کی ابتداء کردی تھی۔ اپنے بارے میں خود ان کا بیان ہے ''میں نے نافعؒ کے پاس اس وقت آنا شروع کیا (حصول علم کے لئے) جب کہ میں چھوٹا تھا''(۴۱)۔

یہاں جن نافعؒ کا ذکر ہے یہ وہ نافع نہیں ہیں جن سے تجوید وقراءت کا علم حاصل کیا، یہ نافعؒ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے جو تیس برس حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں رہے، ان کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت حدیث کی۔ امام اوزاعیؒ، امام ایوب سختیانیؒ، امام ابن جریجؒ، اور امام مالک بن انسؒ جیسے آئمہ حدیث ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خود ایک محدث، مجتہد اور ناقدِ فن تھے، اپنے دورِ خلافت میں حضرت نافعؒ کو اہل مصر کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔ امام مالکؒ کی عمر چوبیس برس تھی جب حضرت نافعؒ کا (۱۱۷ھ میں) انتقال ہوا۔

حضرت نافعؒ جب تک زندہ رہے، امام مالکؒ ان کے حلقہ درس میں حاضر رہے۔ حضرت نافعؒ سے حضرت ابن عمرؓ کے اقوال پوچھتے اور وہ بیان کرتے۔ امام مالکؒ کو حضرت نافعؒ کے ساتھ اپنے علمی ربط وتعلق پر اتنا ناز تھا، کہا کرتے کہ ''جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافعؒ کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر مجھے اس کی پروا نہیں رہتی کہ کسی اور کی زبان سے بھی اس کی تائید سنوں''۔ امام مالکؒ جس حدیث کو حضرت نافعؒ اور حضرت ابن عمرؓ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں، محدثین اس سند کو ''سلسلۃ الذھب'' یعنی سونے کی زنجیر سے تعبیر کرتے ہیں (۴۲)۔

امام ربیعہ الرائیؒ (م ۱۳۶ھ) امام مالک کے استاد ہیں۔ ان کی والدہ نے انہیں سب سے پہلے انہی کے پاس بھیجا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ ''ربیعہ سے صرف علم ہی نہیں ادب بھی سیکھو''۔ چنانچہ امامؒ نے حدیث اور فقہ دونوں میں امام ربیعہؒ سے استفادہ کیا۔

دیگر اساتذہ

امام مالکؒ نے جن شیوخ سے حدیث اور فقہ حاصل کی، ان میں امام ابن ہرمزؒ (م ۱۴۰ھ) کا نام بھی نمایاں ہے۔ امام ابن ہرمزؒ حدیث اور فقہ کے علاوہ علم کلام کے بھی ماہر تھے، اس لئے خیال یہ ہے کہ امامؒ مالک نے ان سے علم کلام میں بھی استفادہ کیا۔ امام ابن ہرمزؒ کے بارے میں امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے ''ابن ہرمزؒ ان لوگوں کا رد کرنے میں بہت ماہر اور مستعد ہیں جو ذاتی آراء کے مطابق فیصلے کرنے کے عادی ہیں''(۴۳)۔

۴۱۔ حیاتِ مالک ص ۲۰

۴۲۔ مالک حیاتہ وعصرہ ص ۲۶

حضرت ابن ہرمزؒ کی خدمت میں امامؒ سات برس اور بعض روایات کی بنیاد پر آٹھ برس رہے۔ان سے امام مالکؒ بہت متاثر تھے۔ مجلسوں میں ان کے پاکیزہ کردار کی تعریف کرتے۔ ان کی یہ عادت اور بلند حوصلگی خصوصیت سے بیان کرتے کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا اور انہیں اس کا صحیح اور مدلل جواب معلوم نہ ہوتا تو صاف کہہ دیتے کہ مجھے معلوم نہیں۔امام مالکؒ کو ان کا یہ طرز اتنا پسند تھا کہ انہوں نے بھی اسے اپنا لیا تھا(۴۳)۔

امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (م۱۲۴ھ) سے بھی امام مالکؒ نے علم حاصل کیا۔صحابہؓ کے بعد تابعین میں جو لوگ روایت و حدیث کے اساطین ہیں،ان میں امام زہریؒ کا رتبہ حضرت سعید بن مسیبؒ کے سوا سب سے بڑھ کر ہے۔صحاح ستہ جو بلاشبہ مسلم علماء کے لیے ایک قابل فخر کارنامہ ہے،امام ابن شہاب زہریؒ کی روایات سے مالا مال ہے۔امام ابن حزمؒ کے بعد علم حدیث کے یہ دوسرے مدوّن ہیں۔ فقہائے سبعہ اور شیوخ مدینہ کے سینوں میں جو علم منتشر تھا،امام ابن شہابؒ نے اس کو یک جا کیا اور پھر یہی علم امام مالکؒ کی ذات میں مرتکز ہوا۔

ناقدین حدیث کا کہنا ہے کہ امام زہریؒ سے بڑھ کر حدیث کے متن اور سند کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔امام عمرو بن دینارؒ،امام سفیان بن عیینہؒ،امام اوزاعیؒ اور امام ابن جریجؒ جیسے جلیل القدر محدثین امام زہریؒ کے تلامذہ میں شامل ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جس نے ان کے نام کو روشن کیا اور ان کے محفوظ کردہ علم کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا وہ امام مالکؒ ہیں۔امامؒ نے ان سے "الموطا" میں ۱۳۲ حدیثیں روایت کی ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ رجالِ حدیث کے بہت بڑے ناقد ہیں۔ان سے ان کے بیٹے نے پوچھا:"زہریؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ وثوق اور اعتماد کے قابل کون ہے؟" امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا"مالک بن انسؒ سب سے بڑھ کر ہیں"۔

امام جعفر صادقؒ (م۱۴۸ھ) جن کا پورا نام جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب ہے امام مالکؒ کے اساتذہ میں ہیں۔ معروف ناقد رجال علامہ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؒ جیسی شخصیت کے بارے میں یہ پوچھنا کہ وہ کیسے تھے؟ ان کی شان کو گھٹا دینے کے مترادف ہے۔ابن حبانؒ کا قول ہے: امامؒ،سادات اہل بیت،عباد تبع تابعین اور علمائے مدینہ میں سے تھے۔ یحییٰ بن معینؒ نے ان کو مامون وموثوق کہا ہے۔امام مالکؒ نے "الموطا" میں ان کی روایات درج کی ہیں۔

امام محمد بن منکدرؒ (م ۱۳۱ھ) سے بھی امام مالک کا رشتہ تلمذ ہے۔اپنے والد منکدر بن عبداللہؒ،حضرت عبداللہ بن عمرؓ،حضرت عبداللہ بن عباسؓ،حضرت ابوایوب انصاریؓ،حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں۔امام زہریؒ اور امام ابوحنیفہؒ جیسے محدّث اور فقیہ بھی آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ ابن عیینہؒ کا قول ہے کہ"محمد بن منکدر صدق وراستی کے معدن تھے"۔

۴۳۔ جامع بیان العلم ص۲۲۴

امام ابوحازم سلمہ بن دینارؒ (م ۱۴۰ھ) امام محمد بن یحییٰ انصاریؒ (م ۱۲۱ھ) اور امام ابوسعید یحییٰ بن سعید انصاریؒ (م ۱۴۳) کا شمار بھی امام مالکؒ کے شیوخ اور اساتذہ میں ہوتا ہے (۴۴)۔

مجلسِ درس

امام مالکؒ کے علم و فضل کا اعتراف ان کے اساتذہ اور شیوخ کی موجودگی ہی میں کیا جانے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اپنے شیوخ کے ہوتے ہوئے ان کا الگ اور مستقل حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ شیخ الفقہ امام ربیعہؒ (م ۱۳۶ھ) زندہ تھے کہ آپ فقہ و فتویٰ کے مرجع بن گئے تھے۔

امام مالکؒ نے اپنی مجلسِ درس کب آراستہ کی، اس کا تعین کوفہ کے ایک بڑے محدث شعبہؒ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ "میں نافعؒ کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ امام مالکؒ ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں"۔ نافع کا سال وفات ۱۱۷ ھ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کے حلقہ درس کا آغاز کم و بیش اسی زمانے میں ہوا۔ امام صاحب کی مجلس درس بہت پر تکلف اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ ہوتی، وسط مجلس میں شہ نشین تھا، اس پر املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے۔ صفائی کا یہ عالم ہوتا کہ فرش پر کہیں ایک تنکا بھی نظر نہ آتا۔

امام کے کاشانۂ علم و فضل پر بارگاہ شاہی کا گمان ہوتا تھا۔ طلبہ کا ہجوم، علماء اور امراء کی حاضری، سیاحوں کا اژدحام اور درخانہ پر سواریوں کی قطاریں دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا (۴۵)۔

تلامذہ

امام مالکؒ سے براہ راست استفادہ کرنے والوں کا تعلق کسی خاص علاقے سے نہ تھا۔ مشرق و مغرب کے طالبانِ علوم ان کے درس میں شریک ہوئے اور پھر وہ امام مالکؒ کے علم کو پھیلانے کا ذریعہ بنے۔ مدینہ میں ان کے جن تلامذہ نے ان کے علم اور بطور خاص فقہ کو زندہ رکھا، ان میں عبدالعزیز بن حازمؒ (م ۱۸۵ھ) محمد بن ابراہیم بن دینارؒ (م ۱۸۲ھ) اور معن بن عیسیٰؒ (م ۱۹۸ھ) قابل ذکر ہیں۔

بصرہ میں عبداللہ بن سلمہ مقنیؒ (م ۲۲۱ھ)، نیشاپور میں یحییٰ تمیمیؒ (۲۲۶ھ) مصر میں عبدالرحمان بن قاسمؒ (م ۱۹۱ھ) عبداللہ بن وہبؒ (م ۱۹۷ھ)، اشہب بن عبدالعزیزؒ (م ۲۴۰ھ) اور عبداللہ بن عبدالحکمؒ (م ۲۱۴ھ)، شمالی افریقہ میں علی بن زیاد تونسیؒ (م ۱۸۳ھ)،

۴۴۔ الانتقاء ص ۲۵

۴۵۔ حیاتِ مالک ص ۸۲

عبداللہ بن غانم افریقیؒ (م۱۹۰ھ) اور اندلس میں ابومحمد یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسیؒ (م۲۳۴ھ) نے فقہ امام مالکؒ کی بھرپور نمائندگی کی اور اس کی ترویج اور اشاعت کا ذریعہ بنے۔

وفات

سیوطیؒ اور زرقانیؒ کے بقول امام مالکؒ نے گیارہ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ بعض نے چودہ، بعض نے گیارہ اور بعض نے دس ربیع الاول تاریخ وفات بیان کی (۴۶)۔ آپ نے چھیاسی سال عمر پائی۔ ساٹھ برس مسند درس اور منصب افتاء پر فائز رہے۔

امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد

امام مالکؒ نے مدینہ کے فقہائے سبعہ سے فقہ حاصل کی، ان کے علاوہ دوسرے اہل علم سے بھی استفادہ کیا۔ فقہ اہل مدینہ کے علاوہ دوسرے علاقوں کی فقہ سے بھی واقفیت حاصل کی، ان کے اصول اور طریق کار کا مطالعہ کیا اور پھر خود دوسروں کو حدیث اور فقہ کی تعلیم دینا شروع کی۔ دور دراز علاقوں سے طالبان علوم آپ کی خدمت میں آتے، آپ ان کو وہی سکھاتے جو آپ نے اپنے بڑوں سے سنا اور سیکھا تھا اور اسی کے مطابق فتوے دیتے۔ اپنے سیکھے اور سنے ہوئے میں سے جواب نہ دے سکتے تو سنے ہوئے میں اس کی نظیر تلاش کرتے اور اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ کوئی نظیر نہ ملتی تو پھر اجتہاد کرتے اور کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم اخذ کرتے۔

امام مالکؒ کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جنہوں نے تدوینِ حدیث میں پہل کی اور احادیث کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جو ایک طرف مجموعہ احادیث تھا اور دوسری طرف اس کی حیثیت ایک فقہی کتاب کی بھی تھی اس میں امام مالکؒ نے مختلف فیہ مسائل میں اپنی فقہی آراء کا اظہار کیا۔ درحقیقت اسی کتاب "الموطا" سے فقہ امام مالکؒ کی بنیاد پڑی۔

"الموطا" میں امام مالکؒ نے اہل حجاز کی قوی احادیث کو جمع کیا۔ اس کے ساتھ صحابہؓ اور تابعین کے اقوال اور فتاوی جمع کیے۔ اسے فقہی ابواب پر مرتب کیا اور عام مجموع ہائے احادیث سے اس کی ترتیب اور اسلوب مختلف رکھا۔

امام مالکؒ کو یہ شرف ملا کہ ان کی دونوں حیثیتیں۔ محدث اور فقیہ۔ اہل علم کے نزدیک تسلیم کی گئیں۔ امام ابوحنیفہؒ کو جمہور اہلِ علم نے ایک فقیہ اور مجتہد کی حیثیت سے تو بے جھجک مانا اور اس کے معترف ہوئے کہ رائے اور اجتہاد کی وادی میں ان کے قدم سب سے آگے ہیں۔ مگر انہیں ایک محدث ماننے میں بہت سے اہل علم تذبذب کا شکار ہو گئے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی صورت حال امام ابوحنیفہؒ سے مختلف ہوئی۔ ان کو جلیل القدر محدث تو سب نے مانا لیکن فقیہ و مجتہد ماننے سے بعض اہل علم نے انکار کر دیا۔ بات صرف ترجیح تک رہی۔ بعض نے کہا کہ علم حدیث میں ان کا اشتغال زیادہ تھا۔ ان کی نظر مسجد نبوی کے درس حدیث پر تھی۔ "الموطا" کو بھی انہوں نے مجموعہ حدیث جانا۔

۴۶۔ نظرۃ عامۃ فی الفقہ الاسلامی ص ۱۵۸

جن حضرات نے ان کے اصولِ اجتہاد پر غور کیا اور دیکھا کہ امام ابوحنیفہؒ قیاس سے آگے بڑھ کر استحسان اور عرف و عادت کو مصدرِ تشریع بناتے ہیں، امام مالکؒ بھی ان سے کچھ زیادہ پیچھے نہیں۔ وہ اسی استحسان کو مصالح مرسلہ کے نام سے استنباطِ احکام کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں، یہاں تک کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے ان کو فقہائے اہلِ رائے میں شمار کیا (۴۷)۔

کیا امام مالکؒ اہل الرائے تھے؟

امام مالکؒ کو اہل الرائے میں شمار کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت حجاز میں رائے ان اصطلاحی معنی میں مستعمل نہیں تھی جن میں بعد کے ادوار میں ہوئی۔ رائے کے معنی تھے سمجھنا اور خوبی کے ساتھ پالینا، نہ کہ فقہی احکام کے استخراج میں عقل کو کام میں لانے کی قوت۔ اس کی وضاحت خود امام مالکؒ نے کی۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"رائے سے میری مراد اپنی رائے قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان اہل علم و فضل اور قابلِ اقتداء آئمہ سے سماع ہے جن سے میں نے علم حاصل کیا ایسے بزرگوں کے علم کو میں نے اپنی رائے سے تعبیر کیا ہے۔ درحقیقت ہم نے یہ رائے صحابہ کرامؓ سے وراثتاً پائی ہے۔ چنانچہ یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ آئمہ سلف کی ایک جماعت کی رائے ہے۔ جب میں "الامر المجتمع علیہ" کہتا ہوں تو اس سے مراد وہ قول ہوتا ہے جس پر اہل علم و فقہ کا بغیر کسی اختلاف کے اجماع ہو۔ جب میں "الامر عندنا" کہتا ہوں تو اس سے مراد وہ بات ہوتی ہے جس پر ہمارے ہاں لوگوں کا عمل ہو، جس کے مطابق احکام جاری ہوتے ہوں اور جسے عالم و جاہل سب جانتے ہوں۔ جس چیز کے بارے میں "لا ادری" کہتا ہوں تو اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جسے میں اقوال علماء میں سے پسند کرتا ہوں۔ میں اپنے اجتہاد میں اہل مدینہ کی رائے سے بال برابر قدم نہیں رکھتا" (۴۹)۔

امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کی طرح باقاعدہ اصول اجتہاد نہ مرتب کیے اور نہ اس بارے میں الگ سے کوئی رسالہ لکھا۔ بلکہ اس معاملے میں امام ابوحنیفہؒ کے نقش قدم پر چلے۔ استنباط احکام کے جو اصول اور طریقے اہل علم و فقہ میں رائج ہو چکے تھے امام مالکؒ نے اپنے ہم عصر امام ابوحنیفہؒ کی طرح ان سے بھرپور استفادہ کیا اور انہیں کام میں لاتے ہوئے ان معاملات اور مسائل کے احکام معلوم کیے جن کی نشان دہی کتاب اللہ اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نصوص سے نہیں ہوتی تھی۔

فقہ امام مالکؒ کے ترجمان قاضی عیاضؒ، امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد کی بحث میں لکھتے ہیں:

"امام مالکؒ کے ادلّہ بڑے مربوط اور طریقِ اجتہاد انتہائی عقلی اور منطق ہے۔ وہ کتاب اللہ کو دوسرے تمام آئمہ مجتہدین کی طرح سب سے مقدم رکھتے تھے۔ کتاب اللہ سے استدلال کے بارے میں ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ نصوص قرآن کو اوّلیت دیتے، پھر ظواہر کو لیتے اور تیسرے درجے میں مفاہیم سے استدلال کرتے"۔

۴۷۔ ترتیب المدارک ۱/۱۹۴

۴۸۔ حوالہ بالا ۱/۱۷۷، ۱۷۸

"کتاب اللہ کے بعد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مصدر تشریع مانتے ہیں۔ سنت کو دلیل اور مصدر تشریع ماننے میں بھی ان کا موقف بڑا اصولی اور منطقی ہے۔ ہر قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ایک درجہ پر نہیں رکھتے۔ احادیث کو سند کے اعتبار سے اصولیین نے جن اقسام میں تقسیم کیا ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ سنت میں وہ خبرِ متواتر کو اوّلیت دیتے ہیں، پھر خبر مشہور، اس کے بعد خبر واحد۔ پھر احادیث میں بھی انہی تین مراتب کو معتبر مانتے ہیں جنہیں کتاب اللہ میں معتبر مانا تھا، یعنی پہلے نصوص، پھر ظواہر اور اس کے بعد مفاہیم سے استدلال کرتے ہیں"(۴۹)۔

قاضی عیاضؒ نے امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد میں کتاب اللہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عملِ اہلِ مدینہ اور قیاس کو ذکر کیا مگر اجماع کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ مدینہ کے عمل اور اتفاق ہی کو امام مالکؒ اجماع سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک فقہائے مدینہ کا اجماع ہی دراصل اجماع ہے۔ اس لئے قاضی عیاضؒ نے الگ سے اجماع کا ذکر نہیں کیا۔ گویا اجماع اور عملِ اہلِ مدینہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

تعاملِ اہلِ مدینہ اور اجماع فقہائے صحابہؓ سے باہر نہ جانے کے سبب امام مالکؒ کے بارے میں بعض اہل علم نے یہاں تک کہا کہ امام مالک نے اپنی فقہ میں اپنے آپ کو فقہائے مدینہ کا ایک حد تک تابع کر لیا تھا کہ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ پچھلوں کے مقلد تھے (۵۰)۔

قاضی عیاضؒ اور دوسرے علمائے اصول نے فقہ امام مالکؒ کے جو اصول بیان کیے ہیں ان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

۱-کتاب اللہ، ۲-سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۳-اجماع صحابہؓ، ۴- اجماع اہل مدینہ، ۵-قیاس، ۶-قول صحابی، ۷-مصلحت مرسلہ، ۸-عرف وعادت، ۹- سدِّ ذرائع، ۱۰-استصحاب اور ۱۱-استحسان۔

شاطبیؒ نے فقہ امام مالکؒ کے اصول کو صرف چار میں منحصر کر دیا۔ الکتاب، السنۃ، اجماع اور رائے۔ عمل اہل مدینہ اور قولِ صحابی کو انہوں نے سنت میں شمار کیا اور کہا کہ یہ سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ باقی دوسرے ادلہ کو رائے کے زمرے میں رکھا کیوں کہ وہ رائے کی ہی مختلف صورتیں ہیں (۵۱)۔

کتاب اللہ کے بارے میں امام مالکؒ کا نقطہ نظر

کتاب اللہ کے بارے میں امام مالکؒ کبھی بحث وتمحیص میں نہیں پڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی شخص قرآن حکیم کے بارے میں

۴۹۔ الاعتصام ۳۱۲/۱

۵۰۔ حوالہ بالا

۵۱۔ المستصفی ۳۸۴/۱

کی سے مناظرہ اور مجادلہ کرتا ہے تو وہ ایسا ہے جیسے کہ وہ اس چیز میں کمی بیشی کا ارادہ کرتا ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی۔

ان سے ایسی بھی کوئی روایت نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ انہوں نے اس بارے میں کوئی رائے دی ہو کہ قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے یا صرف معنی کا۔ ان کا مسلک جمہور علماء کے مطابق یہی تھا کہ قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہ کہتے تھے کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اسی بناء پر ان کا عقیدہ تھا کہ نماز میں متن قرآن پڑھنا ضروری ہے، اگر کوئی قرآن کا ترجمہ پڑھے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی طرح امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ کتاب اللہ میں سب سے مقدم اس کے نص کو رکھا جائے گا اس کے بعد ظاہر کو لیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام مالکؒ بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرح نص اور ظاہر کے درمیان فرق کرتے ہیں اور نص کو ظاہر پر ترجیح دیتے ہیں (۵۲)۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ کی بناء کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ حدیث خواہ مسند ہو یا مرسل۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے قضایا (فیصلوں) پر، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل اور ان کے فتاویٰ پر، اس کے بعد دوسرے صحابہؓ اور فقہائے مدینہ پر (۵۳)۔

سنت کے بارے میں امام مالکؒ کا نقطہ نظر

سنت کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف یہ ہے کہ وہ امکانی حد تک اسے قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ سنت سے اخذِ احکام کے جب تمام دروازے بند ہو جائیں پھر وہ رائے اور اجتہاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ احادیث میں اگر انہیں حدیث مرسل یا حدیث موقوف بھی مل جائے تو اس پر اپنے مسلک کی بناء قائم کر لیتے ہیں، اجتہاد نہیں کرتے، حتی کہ اگر انہیں کسی صحابی کا کوئی قول، فتوی یا فیصلہ مل جائے تو وہ اسے بھی قبول کر لیتے ہیں اور قیاس سے گریز کرتے ہیں۔

مرسل اور موقوف حدیث پر عمل کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور علماء اور فقہاء اور بطور خاص امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ اور ان دونوں کے تلامذہ اور اکثر تبع تابعین ان پر عمل کرنے کو صحیح جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت عمر فاروقؓ، دوسرے اکابر صحابہؓ اور اہل مدینہ میں سے تابعین کی جماعت سے استدلال کرنا درست ہے۔

امام مالکؒ اسی مسلک پر قائم اور عامل ہیں۔ ان کے نزدیک کسی حدیث کا مرسل یا موقوف ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں۔ اس اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ ان کے اصحاب، تبع تابعین اور خود امام مالکؒ کے نزدیک "الموطأ" ساری صحیح ہے اور مرسل و موقوف احادیث کی

۵۲۔ المسوّیٰ شرح موطا (مقدمہ)

۵۳۔ حوالہ بالا

شمولیت سے اس کی صحت اور درجہ استناد پر کوئی اثر نہیں پڑتا (۵۴)۔

خبرِ واحد کے بارے میں امام مالکؒ کا رویّہ یہ ہے کہ وہ اس بات کی قید لگاتے ہیں کہ وہ عملِ اہلِ مدینہ کے خلاف نہ ہو۔ اگر خبرِ واحد عملِ اہلِ مدینہ کے خلاف ہو تو وہ خبر واحد کو چھوڑ دیتے ہیں اور عملِ اہلِ مدینہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ مدینہ سنتِ نبوی کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ ان کا عمل اگر خبرِ واحد کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث منسوخ ہو چکی ہے، ورنہ اہلِ مدینہ کا عمل اس کے خلاف نہ ہوتا بلکہ اس کے مطابق ہوتا۔ نیز امام مالکؒ اہلِ مدینہ کے عمل کو اس درجہ میں مانتے ہیں جیسے ایک جماعت دوسری جماعت سے روایت کر رہی ہو۔ ایک جماعت کی دوسری جماعت سے روایت یقیناً خبرِ واحد سے زیادہ قوی ہے اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اسے خبرِ واحد پر مقدم رکھا جائے اور حکم کی بنیاد بنایا جائے۔

ابن رشدؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے بعض اخبارِ آحاد کو صرف اس بنیاد پر رد کر دیا کہ وہ عمل اہل مدینہ کے خلاف تھیں یا یوں کہیے کہ عمل اہل مدینہ ان کے خلاف تھا (۵۵)۔

اہل مدینہ کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل اور فقہائے مدینہ کے اجماع ہی کو حجت سمجھتے تھے، جب کہ دوسرے تمام فقہاء ان کی اس رائے سے متفق نہ تھے۔ اس سلسلے میں امام لیث بن سعدؒ نے انہیں جو مفصل خط لکھا وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خط اس خط کے جواب میں ہے جو ابتداً ان کو امام مالکؒ نے لکھا تھا۔ اس کے حوالے ملتے ہیں، پورا متن دستیاب نہیں۔ امام لیث بن سعدؒ کے خط کا متن حافظ ابن قیمؒ نے "علام الموقعین" میں نقل کیا ہے۔

امام لیث بن سعدؒ لکھتے ہیں:

"آپ کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ میں یہاں ایسے فتاویٰ دیتا ہوں جو آپ کے یہاں کی عام جماعت کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے آپ نے اللہ سے ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ آپ کی تحریر نے مجھ پر وہی اثر کیا جس کی آپ کو امید تھی۔ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو شاذ اور منفرد فتاویٰ کو مجھ سے زیادہ مکروہ سمجھتا ہو، علمائے مدینہ کی مجھ سے زیادہ عزت و توقیر کرتا ہو اور مجھ سے زیادہ ان کے متفق علیہ کو قبول کرنے والا ہو۔ والحمد للہ رب العالمین الذی لا شریک لہ۔ آپ نے جو یہ لکھا کہ نبی علیہ السلام نے مدینہ میں قیام فرمایا، صحابہؓ کے سامنے وہاں آپ پر قرآن نازل ہوا، آپ نے انہیں قرآن کی تعلیم دی، اس کی تشریح و توضیح کی تو واقعی ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ نے جو قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

۵۴۔ بدایۃ المجتہد ۱۶۸/۱

۵۵۔ اعلام الموقعین ۸۳/۳

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ ۹:۱۰۰)

جن لوگوں نے دین میں پہل کی، مہاجرین اور انصار میں سے اور پھر جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

ان سابقین اولین میں بہت سے لوگ اللہ کی رضا کی تلاش میں جہاد کے لئے نکلے، انہوں نے بستیاں بسائیں، چھاونیاں قائم کیں، دوسرے علاقے کے لوگوں سے ان کا ربط وضبط ہوا، انہوں نے اللہ کی کتاب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی انہیں تعلیم دی۔ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا، وہ انہیں سکھایا۔ ہر بستی اور ہر چھاونی میں ایک ایسی جماعت قائم ہوگئی جو کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین معلم تھی۔ جن مسائل اور حوادث کا حکم قرآن اور سنّت میں نہ تھا' اس میں وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرتے تھے' جس کی ابتداء خلفائے راشدین نے کی تھی۔ ان کی آراء اور اجتہادات کے خلاف ہمیں جب تک کوئی حکم نہ ملے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان پر عمل نہ کریں اور اپنے آپ کو ایک شہر کے علماء تک محدود کرلیں۔''

عمل اہل مدینہ سے کیا مراد ہے اور اس بارے میں امام مالکؒ کا اپنا موقف کیا ہے وہ اہل مدینہ سے کس طبقہ کو مراد لیتے ہیں؟ اس میں ان کی دو رائیں منقول ہیں' ایک تو یہ کہ عمل اہلِ مدینہ سے فقہائے مدینہ کا عمل مراد ہے لیکن راجح اور مشہور رائے یہ ہے کہ اس میں فقہاء اور غیر فقہاء کی قید نہیں۔ جس بات پر بھی مدینہ کے لوگ جمع ہو جائیں وہ حجت ہے (۵۶)۔

اجماع کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

اجماع کے بارے میں بھی امام مالکؒ نے عمل اہلِ مدینہ کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع حجت ہے، وہ اہل مدینہ کے علاوہ کسی اور عالم اور فقیہ کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ اپنی کتاب "الموطأ" میں مختلف مواقع پر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک متفق علیہ امر یہ ہے' تو اس سے اہل مدینہ کا اجماع مراد ہوتا ہے (۵۷)۔

یہ بات بھی کہی گئی کہ "هذا هو الامر المجتمع عليه عندنا" سے مراد یہ ہے کہ کسی امر پر اہلِ علم اور اہلِ فقہ اس طرح متحد و متفق ہو گئے ہوں کہ کوئی اختلاف کرنے والا نہ ہو (۵۸)۔

جس امر پر اہل مدینہ کا اجماع ہو، اسے امام مالکؒ بلاشک وشبہ حجت لازمہ سمجھتے ہیں، نیز عمل اہل مدینہ سے استدلال کرتے ہیں، لیکن

۵۶۔ المستصفی ۱/۱۸۷

۵۷۔ ترتیب المدارک ۱/۳۴

۵۸۔ مناہج الاجتہاد ص ۶۳۵

ان صورتوں کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ خود اہل مدینہ کے عمل میں اختلاف ہو، مدینہ میں مقیم صحابہؓ، تابعین اور اہلِ علم کی آراء کسی معاملے میں مختلف ہوں تو ان کا موقف یہ ہے کہ وہ ان آراء سے باہر نہیں جاتے، انہی میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دے لیتے ہیں اور اس رائے اور عمل کو ترجیح دیتے ہیں جسے قرآن یا سنت سے نسبتاً زیادہ قریب سمجھتے ہیں (۵۹)۔

قیاس کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

امام مالکؒ پچاس سال سے زیادہ مسند درس پر فائز رہے۔ مسائل کے علم اور ان کے احکام معلوم کرنے کی خاطر دور دراز علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھ رہا تھا، مسائل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر روز ایک نیا حادثہ اور واقعہ پیش آتا اور لوگ اس کا حکم معلوم کرنے کے لئے مضطرب اور بے چین ہوتے۔ ان حالات میں امام مالکؒ جیسے محدث اور فقیہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔ امورِ دین میں بھرپور رہنمائی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک قرآن وسنت کے نصوص پر وسیع نظر نہ ہو۔ ان کے قریب وبعید مقاصد کا علم ہو، مقاصد شریعت سے آگاہی ہو اور اقوالِ صحابہؓ پر گہری نظر ہو۔ امام مالکؒ ان سب امور کے جامع تھے۔ نو بہ نو مسائل نے ایک فقیہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ عام لوگوں کو ان مسائل کے احکام سے بھی آگاہ کریں جن کا ذکر نہ نصوص میں ہے اور نہ صحابہؓ کے اقوال، فتاوی اور قضایا نے ان کی نشان دہی کی ہے۔ غیر منصوص احکام معلوم کرنے کے لئے قیاس کو اختیار کرنا پڑا۔

امام مالکؒ جب کسی مسئلے میں نہ کتاب و سنت سے کوئی نص پاتے، نہ اس بارے میں اجماع ہوتا، نہ کسی صحابی یا تابعی کا کوئی قول یا فتوی ملتا تو پھر وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرتے تھے۔ امام مالکؒ نے اجتہاد بالرائے کے متعدد طریقوں کو اپنایا تھا، ان میں وہ قیاس کو کثرت سے استعمال کرتے تھے، حتی کہ انہوں نے بعض ایسے مسائل میں بھی قیاس کیا جن میں اہل مدینہ کا اجماع تھا یا صحابہؓ کے فتاوی منقول تھے۔ وہ قیاس میں اس حد تک توسیع کے قائل تھے کہ صرف نصوص سے ثابت شدہ احکام ہی پر قیاس نہیں کرتے تھے بلکہ ان احکام پر بھی قیاس کرتے تھے جو اولاً قیاس کے ذریعے مستنبط ہوتے تھے۔ وہ فروع میں کسی ایک فرع میں قیاس کرتے ہیں اور جب اس میں قیاس مکمل ہو جاتا ہے تو پھر علت کے اشتراک اور مشابہت کی بناء پر دوسری فرع میں بھی قیاس کرتے ہیں۔

قیاس کا دائرہ امام مالکؒ نے یہاں تک وسیع کیا کہ حدود و کفارات میں بھی قیاس کے قائل ہوئے بشرطیکہ اس کے معنی اور علت سمجھ میں آتے ہوں۔ حالاں کہ فقہائے احناف، جن کی فقہ، فقہ الرائے کہلاتی ہے، حدود و کفارات میں قیاس سے گریز کرتے ہیں، خواہ ان کے معانی اور اسباب وعلل سمجھ میں آتے ہوں یا نہ آتے ہوں (۶۰)۔

۵۹۔ حوالہ بالا ص ۶۳۷

۶۰۔ الموافقات ۱۸/۴،

استحسان کے بارے میں امام مالک نے فرمایا کہ علم کے دس حصوں میں سے نو حصے استحسان ہے (۶۱)۔

مصالح مرسلہ کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

مصلحت مرسلہ بھی امام مالکؒ کے نزدیک مصادرِ شریعت میں سے ایک مصدر ہے۔ امام مالکؒ اس کے ماننے والوں اور اس کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کا حل معلوم کرنے میں سرفہرست ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ سراسر مصلحت ہے۔ اگر اس میں لوگوں کی مصلحتوں اور منفعتوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس کا بنیادی مقصد فوت ہو جائے گا۔ امام مالکؒ اگرچہ مصالح مرسلہ کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن بے قید طریقے سے نہیں، کچھ قیدیں اور شرطیں لگاتے ہیں تاکہ ان کے سبب وہ درجہ استناد حاصل کر سکیں اور ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ مثلاً:

۱- ملائمت یعنی مصلحت شارع کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ کسی اصول کے مخالف نہ ہو اور اس کے احکام کے مآخذ میں سے کسی مأخذ کے منافی نہ ہو۔ بلکہ یہ مصالح کی اس جنس سے ہو جس کا حصول شارع کا مقصود ہے یا کم از کم اس کے قریب تر ہو۔ بالکل نامانوس، نادر اور بہت بعید نہ ہو۔

۲- اپنی ذات سے بھی قابل فہم ہو اس طرح کہ اگر عقل سلیم کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اسے قبول کر لے۔

۳- اس پر عمل کرنا انتہائی ضروری تحفظ کے لئے ہو یا تنگی دور کرنے کے لئے۔

ان شرائط کے ساتھ اس میں اس شرط کا اضافہ بھی ضروری ہے کہ جس مصلحت پر حکم کی بنیاد رکھی جا رہی ہے وہ حقیقی مصلحت ہو اور عامہ مسلمین کی ہو۔ خاص فرد یا خاص افراد کی مصلحت نہ ہو۔ اس سے کسی خاص فرد یا مخصوص افراد کا فائدہ مقصود نہ ہو (۶۲)۔

عرف وعادت کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

امام مالکؒ نے استصحاب اور عرف کو بھی تسلیم کیا ہے۔ عرف کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ وہ نصِ قطعی کے نہ ہونے کی صورت میں اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے وہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کو جائز سمجھتے ہیں۔ جن احکام کا مواد معاشرہ کے عرف وعادت پر ہے وہ عرف وعادت کے تغیر سے بدل جاتے ہیں، جیسا کہ فقہائے احناف کا مسلک ہے۔

امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد اور اسلوبِ اجتہاد کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فقہِ شافعی اور فقہِ حنبلی کے بالمقابل اس میں اجتہاد بالرائے کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ اسی کے باوجود ان کی خوبی یہ ہے کہ سنت اور اس کے مختلف طریقوں کے تمسک اور استدلال میں بھی ان کے قدم بہت مضبوط ہیں۔

۶۱۔ المدخل للفقه الاسلامی ص ۱۰۳،

۶۲۔ مناہج الاجتہاد ص ۲۳۶

امام مالکؒ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو تعصب سے دور رکھا۔ اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ''اس بات پر نظر رکھو کہ اس دین کا منشاء کیا ہے اور ہم اسے کس طرح پورا کر سکتے ہیں۔ میں ایک انسان ہوں، مجھ سے ہر لحظہ غلطی کا امکان ہے، میری رائے اور اجتہاد میں کوئی بات قرآن اور سنت کے خلاف دیکھو تو اسے چھوڑ دو'' (۶۳)۔

مالکی مسلک کی ترویج واشاعت، حلقہ ءِاثر

مدینہ نزولِ وحی الٰہی کا مقام اور اہلِ سنت کا گہوارہ تھا۔ وہاں ایک قسم کا مدرسہ (School of thought) قائم ہوا جو مدرسہ اہل حجاز یا مدرسہ اہل مدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی بنیاد حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کے دور میں پڑی۔ صحابہؓ کے بعد اس مدرسہ میں جو محدث اور فقیہ ان کے جانشین ہوئے ان میں حضرت سعید بن مسیبؒ (م ۹۱ھ)، حضرت عروہ بن الزبیرؒ (م ۹۴ھ) حضرت قاسم بن محمدؒ (م ۱۰۱ھ)، حضرت قاسم بن عبدالرحمانؒ (م ۹۴ھ) حضرت سلیمان بن یسارؒ (م ۱۹۷ھ) اور حضرت خارجہ بن زیدؒ (م ۱۰۰ھ) نمایاں ہیں (۶۴)۔

اس طبقہ فقہاء کے بعد مدینہ منورہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے تشریف لائے تھے اور جسے آپ کے دارالہجرت ہونے کا شرف حاصل تھا، حدیث کی مرکزی درس گاہ بن گیا۔ یہیں سے امام مالکؒ کے فقہی مسلک کی ابتداء ہوئی۔ اولاً آپ کا مسلک حجاز میں پھیلا۔ ایسا ہونا ایک طبعی امر تھا کیوں کہ مدینہ ہی میں آپ نے درس وتدریس کی ابتداء کی اور اسی کو فقہ واجتہاد کا مرکز بنایا۔ پوری زندگی مدینہ میں گزاری اور حج کے علاوہ کبھی مدینہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اس لئے ان کی فقہ کی ترویج واشاعت سب سے پہلے مدینہ میں ہوئی اور آہستہ آہستہ ان کا فقہی مسلک پورے حجاز میں پھیل گیا (۶۵)۔

اس کی ایک بنیادی وجہ تو ان کی مجلسِ درس ہے۔ مسجد نبوی میں ان کے درسِ حدیث کو جو قبولِ عام حاصل ہوا وہ اس دور میں کسی بھی محدث کا حصہ نہ بن سکا۔ پھر یہ مجلس درس اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ نصف صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک قائم رہی اور قریب وبعید کے بے شمار لوگوں نے آپ کی مجلس درس حدیث سے استفادہ کیا۔

دوسری بنیادی وجہ ان کی مشہور تالیف '' الموطأ '' ہے جو مدینہ ہی میں مرتب و مدون ہوئی اور جس کا دور تدوین ۱۳۰ھ-۱۴۰ھ کا درمیانی عرصہ ہے۔ '' الموطأ '' مالکی فقہ کی نہ صرف یہ کہ خشت اول ہے بلکہ فقہ مالکی میں اس کی حیثیت مرکزی بھی ہے۔ امام مالکؒ کے اجتہادات '' الموطأ '' ہی کے ذریعے اہل علم تک پہنچے۔ کم وبیش یہی دور فقہ حنفی کی تدوین کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ۱۴۴ھ میں تدوین فقہ سے

۶۳۔ المدخل للفقہ الاسلامی ص ۱۰۳

۶۴۔ الانتقاء ص ۱۲

۶۵۔ مالک- حیاتہ وعصرہ ص ۴۴۴ ومابعد

فارغ ہوئے لیکن انہوں نے تدوین فقہ کا تمام کام کوفہ میں کیا۔اس لئے ابتدائی مرحلے میں فقہ مالکی اور فقہ حنفی میں ٹکراؤ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی (۶۶)۔

امام مالکؒ کے تلامذہ اوران سے براہ راست علم حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وسعت کے ساتھ ساتھ اس میں تنوع بھی ہے۔اس حلقے پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ مختلف سمت وجہت، مختلف علوم کے ماہر اور مختلف ذوق کے ماہر ایک ہی مرکز کے گرد کس طرح جمع ہو گئے تھے۔امام مالکؒ سے استفادہ کرنے والوں میں مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد، فلسفی حتی کہ حکام اور سلاطین تک شامل ہیں۔

امام مالکؒ کا فقہی مسلک سب سے پہلے حجاز میں پھیلا لیکن اس کے باوجود اسے اپنی ابتداء اور نشوونما کے مرکز میں ثبات ودوام حاصل نہ ہوسکا۔ اس صورت حال کو قاضی عیاضؒ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ عظیم الشان فقہی مسلک حجاز کے شہروں میں پھیلا اور پورے علاقے میں چھا گیا۔دوسرے آئمہ اور فقہاء کی آراء کو اس نے مغلوب کر دیا اور ایسا ہونا ایک طبعی امر تھا۔اس لئے کہ یہ مسلک حجاز ہی میں پیدا ہوا اور یہیں پروان چڑھا اور بطور خاص فقہائے مدینہ کی آراء اوران کے اجماع کو اس میں بنیادی حیثیت دی گئی اور انہی کے طریقہ پر اس میں استنباط کیا گیا۔لیکن حالات کی تبدیلی اور تغیر نے اس صورت حال کو متاثر کیا۔اس مسلک کے لیے کئی دور اضمحلال کے آئے۔یہاں تک کہ لوگوں نے کہا کہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ مدینہ میں بھی مالکی مسلک کا کوئی فقیہ اور مجتہد باقی نہ رہا (۶۷)

مدینہ میں امام مالکؒ کے سب سے بڑے شاگرد عبدالملک بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابی سلمہ الماجشونؒ (م۲۱۲ھ) ہیں۔علامہ ابن ماجشونؒ فقیہ وفصیح تھے۔ان سے پہلے مدینہ میں فتوے کا دارومدار ان کے والد پر تھا۔ان کی وفات کے بعد علامہ ابن ماجشونؒ پر رہا۔اپنے دور میں اہل مدینہ کے مفتی رہے۔امام مالکؒ کے بہت سے تلامذہ نے ان سے استفادہ کیا۔علامہ سحنونؒ ان کے بڑے مداح تھے۔علامہ ابن ماجشونؒ مدینہ میں فقہ مالکی کی پذیرائی کا ایک موثر ذریعہ بنے۔

حجاز کے بعد فقہ امام مالکؒ کی ترویج و اشاعت مصر میں ہوئی۔مصر میں اس فقہ کے تعارف کا اوّلین ذریعہ کون بنا؟ اس میں آراء اور اقوال مختلف ہیں۔بعض مورخین نے کہا کہ مصر میں مالکی فقہ کے اوّلین تعارف کا ذریعہ ان کے شاگرد عبدالرحمان بن قاسم (م۱۹۱ھ) بنے۔یہ "الموطأ" کے راویوں میں ہیں۔ "الموطأ" کا ایک نسخہ انہی کا روایت کردہ ہے۔مصر میں ان کی بہت قدر ومنزلت تھی۔خود امام مالکؒ ان کے تقوی اور علم وفضل کے قدردان تھے۔ایک روز ان کی مجلس میں علامہ ابن قاسمؒ کا ذکر ہوا اوران کے بعض ساتھیوں نے ان کے بارے کہا کہ ابن قاسمؒ تو مشک سے بھری ہوئی تھیلی ہے (۶۸)۔

۶۶۔ الامامة والسیاسة ۱۵۵/۲

۶۷۔ مالک حیاته و عصره ص۳۸۲

۶۸۔ کشف الظنون ۲۰۳۲/۲

ابن فرحونؒ کا دعویٰ ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ اور ان کے علوم کو جس شخص نے سب سے پہلے مصر میں متعارف کرایا، وہ عثمان بن حکم جذامیؒ (م ۱۶۳ھ) ہیں (۶۹)۔

حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ کے فقہی مسائل اور ان کی کتاب "الموطأ" کو مصر میں لانے والے اوّلین اشخاص عبدالرحیم بن خالد بن یزیدؒ اور عثمان بن حکمؒ ہیں (۷۰)۔

مصر میں مالکی فقہ وعلوم کا ذریعہ عبدالرحمان بن قاسمؒ بنے ہوں یا عثمان بن حکمؒ، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ دونوں امام مالکؒ کے براہ راست تلامذہ میں شامل ہیں۔ دونوں کم وبیش چند سال کے فرق سے ایک ہی زمانے میں مصر آئے اور وہاں آ کر تعلیم وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ مالکی علوم پہلے ان کے ذریعے مصر میں پھیلے اور پھر ان کے شاگردوں نے بھی یہاں فقہ مالکی کی ترویج واشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ امام مالکؒ کے تین دوسرے شاگرد عبداللہ بن وھبؒ (م ۱۹۷ھ)، یحییٰ بن بکیرؒ (م ۲۳۱ھ) اور سعید بن عفیرؒ (م ۲۲۶ھ) بھی مصر میں ان کے علوم کے مخلص اور مؤثر ترجمان ومبلغ ثابت ہوئے۔ یہ تینوں حضرات بھی "الموطأ" کے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں۔

ابن وھبؒ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر مجھے امام مالکؒ کی صحبت حاصل نہ ہوتی تو میں گمراہ ہو جاتا" (۷۱)۔

ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ امام مالکؒ کے تمام شاگردوں میں سنن اور آثار کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

یحییٰ بن بکیرؒ نے "الموطأ" امام مالکؒ سے چودہ مرتبہ پڑھنے کی سعادت حاصل کی، "الموطأ" میں جو چالیس حدیثیں ثنائی ہیں انھیں یحییٰ بن بکیرؒ نے ایک رسالہ میں جمع کیا ہے۔ اس رسالہ نے مغرب میں اتنی شہرت ومقبولیت حاصل کی کہ علمائے اندلس جب اپنے شاگردوں کو فراغت کی سند دیتے تھے تو اس رسالہ کو تبرکاً پڑھاتے تھے۔ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ اپنی "الجامع الصحیح" میں ان سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں (۷۲)۔

سعید بن عفیرؒ کا شمار مشاہیر مصر میں ہوتا ہے۔ "الموطأ" کے راویوں میں ہیں۔ امام بخاریؒ نے ان سے روایت کی ہے۔ علم حدیث کے علاوہ تاریخ، سیرت، ادب اور علم الانساب میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔

"المدونة الکبریٰ" کے نام سے امام مالکؒ کی آراء اور فتاویٰ پر مشتمل جو پہلا مجموعہ مرتب ہوا، اس کا مقام ترتیب وتدوین مصر ہی ہے۔ ابن قاسمؒ جو مصر میں فقہ امام مالکؒ کے پہلے سفیر ہیں، اس مجموعے کے مرتب ہیں۔

۶۹۔ کشف الظنون ۲۰۳۲/۲

۷۰۔ حوالہ بالا

۷۱۔ الانتقاء ص ۴۸

۷۲۔ بستان المحدثین (اردو) ص ۳۱

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حجاز کے علاوہ مصر میں بھی امام مالکؒ کی فقہ ان کی اپنی زندگی ہی میں رائج ہوگئی تھی۔
مشہور مورخ ابن خلدونؒ (م۸۰۸ھ) نے مغرب میں مالکی مسلک کی ترویج واشاعت پر بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''امام مالکؒ کا فقہی مسلک مغرب اور اندلس میں پھیلا۔ ان علاقوں کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی مالکی مسلک کی ترویج واشاعت ہوئی۔ ان کی کتابوں اور شاگردوں کے ذریعے بیشتر اسلامی ملکوں میں فقہ مالکی کا تعارف ہوا، اگر چہ وہ بہت محدود تھا۔ اس صورت حال کی وجہ یہ ہوئی کہ اندلس اور مغرب کے لوگ عام طور پر سیدھے حجاز جاتے تھے اور وہیں ان کا سفر ختم ہو جاتا تھا۔ مدینہ ان دنوں علم کا مرکز تھا، ہر علاقے کے طالبانِ علوم اسی سرچشمہ علم سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ اس لئے اندلس کے لوگوں نے علم ومعرفت کی جو بھی خوشہ چینی کی وہ حجاز اور پھر اس میں بھی بطور خاص مدینہ سے کی، عراق یا کسی اور خطے سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ امام مالکؒ ہی ان کے شیخ الکل اور امام مجتہد تھے۔''

اندلس اور مغرب کے لوگوں نے امام مالکؒ سے استفادہ کیا، پھر ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ سے کسب فیض کیا اور انہی کو اپنا علمی اور دینی پیشوا بنایا۔

اندلس اور مغرب میں مالکی مسلک کی ترویج واشاعت اور قبول عام کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس علاقے کے لوگ سیدھے سادے اور دیہاتی طرزِ بودوباش کے عادی تھے۔ وہ عراق کے مہذب اور پرتکلف معاشرے سے کوسوں دور تھے۔ حجاز میں بھی یہی صورت حال تھی، وہاں بھی لوگ سادہ زندگی گزارتے تھے اور تکلفات سے مانوس نہ تھے۔ اس طرح اہل مغرب واندلس اور اہل حجاز میں دینی اتحاد واتفاق اور ذہنی وفکری ہم آہنگی ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالکی مسلک بعد کے ادوار میں تہذیبی رنگ وبو سے دور ہی رہا اور اس نے اپنی سادگی کی قدیم روایت کو برقرار رکھا''(۷۳)۔

پانچویں صدی ہجری میں جب مغرب میں بنی تاشفین کی حکومت قائم ہوئی، مالکی فقہ کا اثر ونفوذ اس علاقے میں اور مضبوط ہوگیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بنی تاشفین کے امراء اور احکام دین دار اور سادہ طرزِ بودوباش کے حامل تھے اور تکلف اور تصنع سے پرہیز کرتے تھے۔

اس دور میں فقہ امام مالکؒ کا اس حد تک غلبہ ہوا کہ تمام قاضیوں کو اس بات کا پابند کر دیا گیا کہ وہ کسی مفتی اور فقیہ سے فتویٰ لئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ حکومت کے اس حکم اور فیصلے سے مالکی فقہ کی امامت وسیادت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ کہنا مبالغے سے خالی ہوگا کہ باقی آئمہ ثلاثہ کے فقہی مسلک میں سے کوئی بھی مسلک آج تک اندلس اور مغرب میں فقہ امام مالکؒ پر غالب نہیں آسکا(۷۴)۔

بعد کے ادوار میں جو اہل علم وفضل مالکی فقہ کے ترجمان بنے اور انہوں نے اپنی گراں قدر تالیفات کے ذریعے اسے زندہ رکھا، ان میں نمایاں نام یہ ہیں: عبدالسلام بن سعید تنوخی ملقب بہ سحنونؒ (م۲۴۰ھ) مولّف "المدونة الکبریٰ" ابوبکر محمد بن عبداللہ معروف بہ ابن العربیؒ (م۵۴۳ھ) مولّف "احکام القرآن" ابوالولید محمد احمد بن رشد (م۵۹۵ھ) مولّف "بدایة المجتهد و نهایة المقتصد"۔

۷۳۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۳۹۲
۷۴۔ الانتقاء ص ۱۰،۱۱

اہم نکات

۱۔ فقہ حنفی کے بانی امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ ہیں

۲۔ امام ابوحنیفہؒ انتخابِ حدیث میں بہت محتاط تھے۔ وہ صرف وہی حدیث لیتے تھے جو ثقہ ذریعہ سے ثابت ہو۔

۳۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک استنباطِ احکام کے لیے فقہی مصادر اور دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کتاب اللہ، ۲۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۳۔ اقوال صحابہؓ ۴۔ اجماع، ۵۔ قیاس، ۶۔ استحسان اور ۷۔ عرف وعادت

۴۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو چیز کتاب اللہ سے ثابت ہو وہ قطعی اور جو سنت سے ثابت ہو وہ ظنی ہے۔

۵۔ وہ احکام قرآن کو فرض اور امرِ سنت کو واجب قرار دیتے ہیں۔

۶۔ جس کی ممانعت قرآن سے کی گئی ہے وہ حرام اور جس کی ممانعت سنت سے ثابت ہو وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔

۷۔ امام ابوحنیفہؒ حدیث صحیح کے ذریعے کتاب اللہ کے کسی حکم میں اضافے کو جائز سمجھتے ہیں۔

۸۔ امام ابوحنیفہؒ کتاب اللہ اور سنت کے بعد فتاویٰ واقوال صحابہؓ کو حجت مانتے ہیں۔ اگر ایک مسئلہ میں مختلف صحابہؓ کے اقوال مل جائیں تو خلفائے راشدین کے فیصلوں اور آراء کو ترجیح دیتے ہیں۔

۹۔ امام ابوحنیفہؒ کی اپنی فقہی اساس حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے فتاویٰ وقضایا پر تھی۔

۱۰۔ حنفی مسلک بغداد میں پروان چڑھا اور عراق سے نکل کر شام، مصر، اوراء النہر، ایران اور ہندوستان تک پہنچ گیا۔ اس وقت پوری دنیا کے سنّی مسلمانوں میں دو تہائی حنفی مسلک کے پیروکار ہیں۔

۱۱۔ فقہ مالکی کے بانی امام مالک بن انسؒ ہیں۔

۳۔ اجماع

۱۲۔ اہل علم کے نزدیک امام مالکؒ کی بطور محدث اور فقیہ دونوں حیثیتیں تسلیم کی گئی ہیں۔

۱۳۔ امام مالکؒ کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث "الموطا" سے فقہ مالکی کی بنیاد پڑی۔
امام شافعی استحسان اور مصالح مرسلہ کے شدید مخالف ہیں۔ مصلحت مالکی سلسلے کو صرف اسی صورت میں قبول کیا جب اجماع سے ثابت مصلحت معتبرہ کے مشابہ ہو۔ آپ عمل اہل مدینہ کی حجیت کے بھی قائل نہیں ہیں۔

۱۴۔ فقہ مالکی کے اصولِ اجتہاد مندرجہ ذیل ہیں حجاز، شام، خراسان اور ماوراء النہر میں یہ مسلک پھیل گیا۔ مصر میں اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی جہاں آج بھی اس مسلک کا غلبہ ہے۔
ا۔ کتاب اللہ، ۲۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۳۔ اجماع صحابہؓ، ۴۔ اجماع اہل مدینہ، ۵۔ قیاس، ۶۔ قولِ صحابی،

۶۔ امام احمد بن حنبلؒ بہت زیادہ متبع سنت تھے اور اجتہاد بالرائے سے احتراز فرماتے تھے۔

۷۔ مصلحتِ مرسلہ، ۸۔ عرف و عادت، ۹۔ سد ذرائع، ۱۰۔ استصحاب اور ۱۱۔ استحسان

۸۔ امام احمد بن حنبلؒ کے اصول اجتہاد مندرجہ ذیل ہیں:
علامہ شاطبی نے فقہ مالکی کے اصول اجتہاد کو صرف چار میں منحصر کر دیا:
ا۔ نصوص کتاب اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ کتاب اللہ، ۲۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۳۔ اجماع اور ۴۔ رائے

۱۵۔ امام ابوحنیفہؒ کی طرح امام مالکؒ بھی کتاب اللہ کے نص کو اس کے ظاہر پر ترجیح دیتے ہیں۔
۳۔ اجماع صحابہؓ جو ایسے مسائل میں ہو جن پر انہوں نے غور و فکر کے بعد قرآنی و نبوی احکام کی روشنی میں ایک رائے منتخب کرنے کے بعد اسے اصول بنا لیا ہو۔

۱۶۔ امام مالکؒ عمل اہل مدینہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے ہاں قبل اہل مدینہ فقہاء اور غیر فقہاء کی کوئی قید نہیں ہے۔

۵۔ استصحاب

۱۷۔ امام مالکؒ عمل اہل مدینہ کو خبر واحد پر ترجیح دیتے ہیں۔
۶۔ مصالح مرسلہ

۱۸۔ مصلحت مرسلہ کو بطور مصدر احکام استعمال کرنے والوں میں امام مالکؒ سرفہرست ہیں۔

۹۔ فقہ حنبلی نے حجاز، شام، عراق اور مصر میں اپنے اثرات مرتب کیے۔

۱۹۔ امام مالکؒ کا تعلق مدینہ سے تھا، جہاں حضرت ابن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کے فقہی اجتہادات کے گہرے اثرات تھے۔

کتب برائے مزید مطالعہ

۲۰۔ فقہ مالکی پوری سرزمین حجاز میں پھیل گئی، جس کے بعد مصر، اندلس اور مغرب میں مالکی فقہ رائج ہوگئی۔ اندلس اور مغرب

ا۔ فلسفہ شریعت اسلام از ڈاکٹر صبحی محمصانی، مترجم مولوی محمد احمد رضوی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۲۔ تاریخ فقہ اسلامی از علامہ محمد الخضری بک، مترجم مولانا افتخار احمد بلخی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔

۳۔ آثار امام شافعیؒ از محمد ابو زہرہ مترجم رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، لاہور۔

۴۔ امام احمد بن حنبلؒ از محمد ابو زہرہ، مترجم رئیس احمد جعفری، ملک سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد۔

کتب برائے مزید مطالعہ

۱۔ فلسفہ شریعتِ اسلام از ڈاکٹر صبحی محمصانی، مترجم مولوی محمود احمد رضوری مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور۔

۲۔ تاریخ افکار وعلوم اسلامی (حصہ دوم) از علامہ راغب الطباخ، مترجم مولانا افتخار احمد بلخی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔

۳۔ امام ابوحنیفہؒ از محمد ابوزہرہ، مترجم عبیداللہ قدسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

۴۔ امام مالکؒ از محمد ابوزہرہ، مترجم رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

مصادر ومراجع

۱۔ خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی، تاریخ بغداد، مطبع السعادہ، قاہرہ ۱۹۳۱ء

۲۔ ذہبی، شمس الدین محمد عثمان، تذکرۃ الحفاظ، طبع حیدرآباد دکن، بھارت ۱۹۵۵ء

۳۔ نووی، ابوزکریا محی الدین یحیٰی بن اشرف، شرح مسلم، طبع کراچی۔

۴۔ ابن حجر، احمد بن محمد بن علی، الخیرات الحسان، طبع قاہرہ ۱۳۲۴ھ۔

۵۔ ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنہایۃ، مطبع السعادۃ، قاہرہ ۱۳۴۱ھ۔

۶۔ کردری، محمد بن شہاب، مناقب امام اعظم، طبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ۔

۷۔ موفق ابن احمد مکی، مناقب امام اعظم، طبع دائرہ المعارف، حیدر آباد دکن ۱۳۲۲ھ۔

۸۔ ابن قنفذ قسنطینی، احمد بن حسن الخطیب، الوفیات، طبع بیروت ۱۹۸۰ء۔

۹۔ بزدوی، ابوالحسن علی بن محمد بن حسین، اصول البزدوی، طبع قسطنطنیہ ترکی ۱۳۰۷ھ۔

۱۰۔ آمدی، ابوالحسن سیف الدین علی بن محمد، الاحکام فی اصول الاحکام، مطبعہ المعارف، قاہرہ ۱۹۱۴ء۔

۱۱۔ شعرانی، عبدالوہاب، المیزان الکبریٰ، طبع قاہرہ مصر ۱۹۷۹ء۔

۱۲۔ مدکور، محمد اسلام، ڈاکٹر، مناہج الاجتہاد، طبع دار النہضۃ العربیۃ قاہرہ مصر ۱۹۶۰ء۔

۱۳۔ مدکور، المدخل للفقہ الاسلامی

۱۴۔ محمد ابو زہرہ، ابو حنیفۃ حیاتہ و عصرہ، طبع دار الفکر العربی قاہرہ۔

۱۵۔ محمد ابو زہرہ، مالک حیاتہ و عصرہ

۱۶۔ موسیٰ، محمد یوسف الفقہ الاسلامی، طبع دار الکتب العربی، مصر ۱۹۵۸ء۔

۱۷۔ سیوطی، جلال الدین، تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک، دار احیاء الکتب العربیہ، قاہرہ۔

۱۸۔ ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر۔

۱۹۔ ابن عبدالبر، الانتقاء، مکتبہ قدسی، مصر ۱۳۵۰ھ۔

۲۰۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، المسویٰ شرح موطا (مقدمہ)۔

۲۱۔ علی حسن عبدالقادر، نظرۃ عامۃ فی الفقہ الاسلامی، طبع قاہرہ ۱۹۴۲ء۔

۲۲۔ عیاض بن موسیٰ، قاضی، ترتیب المدارک، طبع ۱۹۶۵ء۔

۲۳۔ شاطبی، ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ، الاعتصام، مطبع المنار، مصر ۱۹۱۳ء۔

۲۴۔ شاطبی، الموافقات، دار المعرفہ، بیروت۔

۲۵۔ غزالی، محمد بن محمد، المستصفیٰ، طبع قاہرہ ۱۹۳۷ء۔

۲۶۔ ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد قاضی، بدایۃ المجتہد، طبع مصر ۱۹۶۹ء۔

۲۷۔ مخالف ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابی بکر، اعلام الموقعین، طبع مکتبۃ الکلیات، قاہرہ ۱۹۶۸ء۔

۲۸۔ ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ والسیاسۃ، مکتبۃ التجاریہ، مصر ۱۳۴۷ھ۔

۲۹۔ ابن خلدون، عبدالرحمن، مقدمہ ابن خلدون، مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر

۳۰۔ حاجی خلیفہ، مصطفیٰ بن عبداللہ، کشف الظنون، طبع استنبول۔

۳۱۔ حنبلی، دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔

مطبوعات

قانونِ اسلامی، اختصاصی مطالعہ: اصولِ فقہ (بذریعہ خط وکتابت)

(Advanced Correspondence Course in Islamic Jurisprudence)

☆☆☆☆☆

۱۔ علم اصولِ فقہ: ایک تعارف (حصہ اوّل)

۲۔ علم اصولِ فقہ: ایک تعارف (حصہ دوم)

۳۔ قرآن

۴۔ سنّت

۵۔ سنّت کی حجیت کا جائزہ

۶۔ اجماع

۷۔ قیاس

۸۔ شرائع سابقہ۔ اقوالِ صحابہؓ۔ استصلاح

۹۔ استحسان۔ استحصاب۔ استدلال

۱۰۔ عرف اور سدّ ذرائع

۱۱۔ حکمِ شرعی۔۱ (حکمِ تکلیفی)

۱۲۔ حکمِ شرعی۔۲ (حکمِ وضعی)

۱۳۔ خاص

۱۴۔ عام۔ مشترک۔ حقیقت ومجاز۔ صریح وکنایہ

۱۵۔ دلالات

۱۶۔ اسلام کا نظریۂ اجتہاد

۱۷۔ مناہج واسالیب اجتہاد

۱۸۔ تقنین (اسلامی احکام کی ضابطہ بندی)

۱۹۔ پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل

۲۰۔ فقہ حنفی وفقہ مالکی

۲۱۔ فقہ شافعی وفقہ حنبلی

۲۲۔ فقہ جعفری وفقہ ظاہری

۲۳۔ قواعد کلیہ (حصہ اوّل)

۲۴۔ قواعد کلیہ (حصہ دوم)